

کوشش زندگی کا پہلا مرحلہ

اور مدد طلب نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔
بیٹے کی آنکھوں کی التجا ان کی نظروں سے جتنی کب رہی
تھی۔ گلا کھار کر اور مکمل طور پر بیوی کی طرف رخ
موڑ کر بیٹھ گئے۔

”ایک دم اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرو۔ سوچ لو
اس کے بعد ہی۔“

”بس کریں آپ اسے صاف اور دو ٹوک
جواب دینے کے بجائے آپ مجھے کہہ رہے
ہیں.....“ وہ بری طرح بھڑکی تھیں۔

”آپ دونوں میری بات کان کھول کر سن
لیں۔ یہ کسی طور بھی ممکن نہیں ہے۔ کم سے کم میری
زندگی میں تو نہیں۔ ہاں میرے مرنے کے بعد یہ
ضرور ہو سکتا ہے۔ تو بیٹا تم یوں کرو۔ اپنے باپ کے
ہمراہ مسجد میں جا کر سجدے میں گر جاؤ اور دعائیں
کرو کہ اللہ مجھے اٹھا لے تاکہ.....“

”کیا ہو گیا ہے امی آپ کو؟“ اس نے جلدی
سے اپنی ماں کے ہاتھوں کو تھاما۔ ”مجھے کچھ بھی کہہ
لیں لیکن پلیز خود کو کچھ بھی نہیں کہیں۔“ اس نے
عقیدت سے ماں کے ہاتھوں کی پشت کو چومتے
ہوئے کہا تھا۔ اور پھر جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھ کر
دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ قریب بیٹھے شوہر نے
ایک تاسف بھری نظر اپنی شریک حیات کے چہرے
پر ڈالی تھی۔

”جوان اولاد کے ساتھ ایسا رویہ ٹھیک نہیں
ہوتا۔“ کمرے سے نکلے سے پہلے اس کے کانوں
میں اپنے باپ کی آواز پڑی تھی۔

کمرے میں پھیلی خاموشی اسے حد سے
زیادہ بری لگ رہی تھی۔ ہرگز رتا لہ اسے شدید بے
چینی میں مبتلا کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس کی منتظر نگاہیں
اپنے سامنے بیڈ پر بیٹھے نفوس پر جمی ہوئی تھیں۔ لیکن
سامنے بیٹھے نفوس حیرت کے سمندر میں غوطہ زن
آنکھیں بھاڑے اس کے منتظر وجود کو غور رہے
تھے۔ نرمی کی ہلکی سی رفق اسے اپنی ماں کی نظروں
میں ڈھونڈنے سے نہیں مل رہی تھی۔ ماں کے چہرے
سے نظروں نے سفران سے کچھ فاصلے پر بیٹھے باپ
کے چہرے کی طرف کیا تھا۔ جہاں حیرت تھی، جتنی
نہیں۔ اس کے دل کو ذرا سا حوصلہ ہوا۔ اس نے
سیا۔ مے ہو کر بیٹھتے ہوئے اپنے خشک ہوتے حلق کو
چائے کے گھونٹ سے تر کیا اور کچھ کہنے کے لیے منہ
کھولا ہی تھا۔ جب اس کی ماں نے ہاتھ اٹھا کر اس
کے کھلم منہ کو بند رکھنے کا اشارہ کیا تھا۔

”تمہاری ہمت کیسی ہوتی مجھ سے یہ بات
کرنے کی۔“ ان کے لہجے میں چنگاریاں سی تھیں۔
”امی ایسے نہیں کریں۔ پلیز، میری بات سمجھنے کی
کوشش کریں۔“

”پلیز امی! ایک بار ٹھنڈے دل سے سوچ لیں
نا۔ اس میں میری خوشی ہے۔“ اس کا لہجہ افسردہ تھا۔
”لیکن اس فیصلے میں میری رتی بھر بھی خوشی اور مرضی
شامل نہیں ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ بہتر ہے اس خیال
کو اپنے دماغ سے نکال دو۔“

”دماغ سے نکال دوں لیکن دل کا کیا
کروں۔“ اس نے دل میں کراہتے ہوئے سوچا تھا۔



لیے اٹھا کلفت، بے چینی اور پریشانی منہ چھپائے
جانے کون سے دلس کل چکی تھی۔ اور وہ من سے
انداز میں بات کرتا واپس گھر آچکا تھا۔
اسے اپنے کمرے میں جاتے دیکھ کر اس کی
ماں نے سکون بھری سانس بھری تھی اور بلیٹ کر خود
بھی سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

☆☆☆

وہ من سے انداز میں اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ
سے کل کر یونی کے مین انٹرس کے قریب پہنچا ہی
تھا۔ جب ٹھٹک کر اپنی جگہ رکا تھا۔ اس نے اپنی
آنکھوں کو کھلیا اور اپنے سامنے پریشانی سے شہتی
اس لڑکی کو دیکھا اس کا چہرہ ہر قسم کے میک اپ سے
مبرا تھا۔ لیکن پھر بھی اس کے چہرے کی مصوویت اور
خوب صورتی دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کر رہی
تھی۔ اور اس پر مستزاد بے چینی سے اپنی ایڑیوں کو اٹھا
کر یونی میں داخل ہوتے طالب علموں کو دیکھا۔ وہ
جانے کس کی تلاش میں تھی۔

اور وہ جو خود احمر کی تلاش میں یہاں آیا
تھا۔ اب میسر اسے بھلائے اسی لڑکی کی طرف متوجہ
تھا۔ یہ شاید اس کے بھٹکنے کا اثر تھا۔ وہ
اب مین گیٹ سے نظر پڑا ہٹائے گردن کو موڑے
ترجمی لگا ہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہے ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ لٹھ مار کے
انداز میں اس سے دریافت کیا گیا۔ ”تمہارے جیسی
تو نہیں دیکھی ابھی تک۔“ وہ دل ہی دل میں اس
سے مخاطب ہوا تھا۔

اور خود اپنی سوچ پر کھل کر مسکرا دیا تھا۔ یہ شاید
اس کے یوں مسکرانے کا اثر تھا۔ وہ غصے کی نظر اشتہر پہ
ڈالتی تا صرف زخ بدل گئی تھی۔ بلکہ وہاں سے چل
بھی پڑی تھی۔ یہ شاید اس کی خاموشی سے جانے کا ہی
اثر تھا۔ اشتہر جی بھر کر شرمندہ ہوا تھا۔

”کیا ہے پار، واپسی تو نے اس ڈیڑھ سال میں
کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔ جو آج اس لڑکی کو یوں
گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔“ اس نے بڑبڑاتے

”آپ اس معاملے میں چپ رہیں۔ یہ میرا
اور میرے بچے کا معاملہ ہے۔ مجھے اچھی طرح سے
پتا ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔“ گردن جھٹکتے ہوئے
انہوں پاس پڑا ریوٹ اٹھا کرٹی وی آن کر لیا۔
”ادنیہ۔“ کہہ کر وہ بھی زخ بدل گئے تھے۔
اور وہ خود اپنے کمرے میں جانے کے بجائے بائیک
لے کر کمرے سے نکل گیا تھا۔ اسے پتا تھا اس کی ماں اپنی
آسانی سے اس کی بات نہیں مانیں گی۔

مجھے اسی کو ماننا ہے۔ انہیں راضی کرنا ہے۔۔۔۔۔
کیسے پر کیسے؟“ ارد گرد سے بے نیاز سوچوں میں الجھا
جانے کے ڈھابے پہ بیٹھا تھا کہ قتل کی آواز پر آنے
والی کال کی طرف متوجہ ہوا۔

”کہاں ہو؟“ پریشانی میں ڈوبی آواز اسے ہر
پریشانی سے آزاد کر دیا۔ اب اس کے لیوں پہ
خوب صورت مسکراہٹ رقصاں تھی۔ آنکھیں
جگمگوں کی مانند چمکنے لگی تھیں۔ اور دل، دل تو جیسے وہ
آواز سن کر پھر سے جی اٹھا تھا۔

”بتاؤ نا، اتنی دیر سے کہاں تھے؟ تم نے مجھے
ایک بھی پیج نہیں کیا۔“ اس کی مدھر آواز میں گھلا شکوہ
اسے طمانیت کے قریب تر کر گیا تھا۔

”تمہارے دل میں ہوں آج کل تو۔۔۔ اور کتنی
نرمی بات ہے۔ مجھے اپنے دل میں قید کر کے تم نے
فرار کی ہر راہ مسدود کر رکھی ہے۔ الٹا مجھ سے ہی پوچھ
رہی ہو۔ کہاں ہوں میں۔“

جب دونوں بات کر رہے ہوتے تو لگتا تھا کہ
ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے محبت راہ میں بے حسین
سپنوں کے رنگ ان کی آنکھوں اور زندگی میں بھرتے
جارے ہیں۔ ایسے رنگ جس کے سامنے زیست کا ہر
رنگ پیکا پڑ جاتا ہے۔ ایسی قوس قزح جس کے
رنگوں کے سامنے کوئی بھی منظر پیارا نہیں لگتا تھا۔ یہ
منظر حسین اور مکمل ہوتا تھا۔

اس وقت بھی یہی تو ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے
کی ہر بات کو بھلائے من سے انداز میں باتیں
کرنے میں مصروف تھا۔ جس وقت وہ واپسی کے

بلکہ میرا نکاح ہو چکا ہے۔ یار۔ بس یونی سے فارغ ہوتے ہی میں اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی میں شامل کر لوں گا۔“ احمر کی آنکھوں میں محبت ہی محبت تھی۔ اور اشتر ہمیشہ کی طرح اس کی اس محبت کے سامنے ہار گیا تھا۔

”اچھا چل۔ کیا یاد کرے گا چلتا ہوں تیرے ساتھ۔ ویسے یہ زمانہ اور اس زمانے کی مشکلیں۔ اپنی بیوی سے بھی ملنے جانا ہے تو بھی دوست کی مدد و کار ہے کہ کہیں کوئی کلی کا عاشق سمجھ کر..... اؤ میرا مطلب ہے یونی کا عاشق سمجھ کر انسٹلٹی ہی نہ کر دے۔“ اشتر نے زور سے احمر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”ذمہ یوں گایا، تجھے بھی۔ جب تجھے محبت ہو گی تب تجھ سے پوچھوں گا۔“ احمر نے اشتر کے ساتھ چلتے ہوئے اسے چھیڑا۔

”فکر مت کر۔ میرا جتنوں بننے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ اشتر نے ہنسنے ہوئے کہا۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے پھیلے ہوئے ہونٹ سکڑے تھے۔

اس روز وہ فیروزی شرٹ کے ساتھ سفید ٹراؤز و رائدر سے سفید ہی اسکارف لیے روٹی صورت بنائے انہیں انکس لٹرچر کی راہداری میں ملی تھی۔

اشتر بے اختیار ہی اپنی جگہ زکا تھا۔ جانے کیوں؟ حالانکہ اس کا زکے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی۔ احمر جو اس سے کئی قدم آگے جا چکا تھا، پلٹ کر اس کے قریب آتا تھا۔

”ارے اوبھائی یہاں کیوں رک گیا؟ چل۔“ احمر نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تھا۔

اس سے پہلے اشتر کچھ بولتا وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے قریب آ کر ڈکی تھی۔

”سنیں۔ پلیز میری ہیلپ کر دیں۔“ وہ ان دونوں سے مخاطب تھی۔

”سواری مس ہم تھوڑا پڑی ہیں۔“ احمر کو اس وقت زوبیہ سے ملنے کی جلدی تھی۔ اس لیے اس نے فوراً ہی انکار کر دیا تھا۔

ہوئے خود سے کہا۔
براس جیسی نہیں دیکھی؟ اس کا دل ایک بار پھر آؤٹ آف کنٹرول ہوا تھا۔ اس بار وہ سنجیدہ ہو کر اپنے دل کو کوڑ پٹنے ہوئے احمر سے ملنے لگا۔ جو حسب معمول آج بھی لیٹ تھا۔ اگر اس نے احمر سے اپنے ضروری نوٹس نہ لینے ہوتے تو وہ بھی اتنی بے تابی سے اس کا انتظار نہ کر رہا ہوتا۔ جیسے ہی نوٹس اس کے ہاتھ میں آئے تھے۔ اس سے اگلے پل وہ اس پہل چکا تھا۔ اور اب احمر، اشتر سے جان بچانے کے لیے آگے آگے تھا اور اب اشتر اس کے پیچھے پیچھے، جلد ہی اشتر، احمر کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ یونی کے بعد شان دار چمکے وعدے پہ اشتر نے اپنے بازو کی قید سے اس کی گردن کو چھوڑا تھا۔ اور اب وہ دونوں ہنستے مسکراتے ہوئے اپنی کلاس کی سمت بڑھ چکے تھے۔

☆☆☆

اس دن بادلوں نے سورج میاں کو بھگا ڈالا تھا۔ سب ہی لوگ جو گرمی سے نالاں تھے۔ ایک دوسرے سے بے زار دکھائی دے رہے تھے۔ اب وہی لوگ آسمان پر موجود بادلوں کی طرح اگھیلیاں کرتے، ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف، اپنی اپنی کلاسوں کو بینک کیے کراؤٹ میں قبضہ کیے ہوئے تھے۔

”یار! مجھے زوبا سے ملنا ہے۔“ احمر کا دل اپنی منکوحہ سے ملنے اور دیکھنے کو بے تاب ہوا جا رہا تھا۔

”میں نہیں جا رہا، تمہیں جانا ہے تو جاؤ۔“ اشتر نے اپنا بیگ کندھے پہ لٹکاتے ہوئے اسے ہری جھنڈی دکھائی تھی۔

”دیکھ، تو میرا پیارا دوست نہیں۔ چل نایار۔“ احمر نے اس کی منت کی۔

”میں نہیں جا رہا یار، اتنا اچھا موسم ہے اور ایسے میں تمہیں اپنی محبوبہ سے ملنے کی پڑی ہے۔ یوں نہیں کہ دوست کو کچھ کھلا پلا دو۔“ اشتر نے اسے چھیڑا۔

”دیکھ، بکواس مت کر۔ زوبیہ میری محبوبہ نہیں

”ارے ایک منٹ زکو“ اشتر نے اپنے ہاتھ کو احمر کے ہاتھ سے الگ کیا۔ اور لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

”وہ ادھر ایک چھوٹا سا بلی کا بچہ اپنا سر پائپ لائن میں پھنسا چکا ہے۔ ہم فریڈ زہیت دیر سے اُسے آزاد کروانے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن.....“ وہ اب اپنی غرولی انگلیاں مسلتی پریشانی سے کہہ رہی تھی۔

”کدھر۔“ اشتر فوراً ہی مدد کے لیے تیار ہوا تھا۔

”ارے یار۔“ احمر سخت جھنجھلایا تھا۔

”دو منٹ یا رہ تم چلو میں آتا ہوں۔“ اشتر غلٹ بھرے میں لہجے میں کہتا اس سمت پلٹ چکا تھا۔ جہاں اس لڑکی نے اشارہ کیا تھا۔ بیک گراؤنڈ میں موجود پائپ لائن میں ایک چھوٹے بلی کے بچے کا سر پھنسا ہوا تھا۔

اشتر فوراً پلٹ گیا اور چوکیدار سے پلاس اور ریتی لے کر واپس آیا۔ اور تقریباً پندرہ منٹ کی کوشش کے بعد وہ اس بلی کے بچے کا سر باہر نکالنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ وہ چھوٹا سا بچہ اشتر کے قریب آتا۔ اور اس کے قدموں سے لپٹ جاتا۔

”ارے یار بس بھی کر۔“ اشتر نے ہنستے ہوئے اس بچے کو اٹھایا۔ اور اپنی نظروں کے عین سامنے کیا۔ ”تھینک یو تھینک یو سوچ۔“ عتابی لبوں پہ مسکراہٹ سجائے وہ اشتر سے مخاطب تھی۔

اشتر نے بلی سے نظریں ہٹا کر اس کی کانچ سی براؤں آنکھوں میں دیکھا۔ جو بیک وقت خوش اور غمی کی چمک سے چمک رہی تھیں۔ مانو کوئی ہیرے کی بنی ہوں۔ اشتر کے دل کی ایک ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی۔ اس نے مشکل سے اس کی نظروں سے اپنی آنکھوں کو چھڑاتے ہوئے اس کے ساتھ کھڑی دونوں لڑکیوں کی سمت متوجہ ہو گیا۔ جو اب اپنا تعارف کروانے میں مصروف تھیں۔

”میں اہم ہوں اور یہ عمیہ ہے اور یہ.....“ اب

کے اہم نامی لڑکی نے بلی کے بچے کے تعاقب میں نظریں دوڑاتی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”نوا ہے۔ نواہ احمد۔ ہم تینوں ہی انگلش لٹریچر کی اسٹوڈنٹس ہیں۔ اور اسی سال ہم نے ایڈمیشن لیا ہے۔“

”نواہ۔“ اشتر کچھ بھر کے لیے چونکا تھا۔ ایک ہلکی سی جھٹک اس کے ذہن کے پردے پہ جھلکائی تھی۔ ”نہیں وہ یہاں کیسے ہو سکتی ہے۔ اب ضروری تو نہیں نواہ بس اسی کا نام ہو۔“ اس نے بلی کے بچے کے پیچھے بھاگتی لڑکی کو غور سے دیکھتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا تھا۔ اور پھر اہم اور عمیہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ جو اسے ایک بار پھر شکریے سے نوازی رہی تھیں۔

”اس اوکے۔“ اس نے جبک کر گھاس پہ پڑے اپنے بیک کو اٹھایا اور کندھے پہ لٹکا کر باقی کی چیزوں کو ہاتھ میں پکڑے اور پر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے تیز تیز قدموں سے سامنے کی سمت بڑھ گیا تھا۔

آسمان بادلوں میں بڑی طرح گھنچکا تھا۔ کسی بھی وقت بادل پانی برسانے والے تھے۔ اور اسے کبھی بارش میں بیٹھنا پسند نہیں تھا۔ پلاس اور ریتی کو واپس کرنے کے بعد ابھی تو اسے احمر کو بھی ڈھونڈنا تھا۔ خدا خدا کر کے روٹھے ہوئے احمر کو ڈھونڈ کر اس سے سواری کرنے کے بعد اشتر اسے یونی کی پارکنگ تک لایا تھا۔ جیسے ہی دوڑوں گاڑی میں بیٹھے تھے، بادلوں نے پانی کے تھال زمین پر الٹا ڈالے تھے۔

”چل یار، جلدی کر۔ یہ نہ ہو میں سڑک پہ حسب معمول ٹریفک جیم ملے۔“ احمر گھر مندھی سے بولا تھا۔

”نہیں تم ابھی مزید کسی روٹھی محبوبہ کی طرح ناراض ہو کر بیٹھ جاؤ۔“ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اشتر نے اسے طعنہ دیا تھا۔

”یار اناراضی والی بات تو بنتی ہے نا۔ اچھا بھلا ہم راستے پہ جا رہے تھے۔ اور بیچ میں وہ لڑکی کسی فلمی

آنکھیں چلی آئی تھیں۔

”لا حول ولاقوة۔“ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ واقعی میں تو یوں لڑی ایکٹ کر رہا ہوں۔ جیسے میں نے کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔“ خود کو ڈپٹے وہ آئینے کے سامنے سے ہٹا اور بیڑھا اتر آیا۔ جہاں اب گفتگو ملک کی سیاست سے ہوتی ہوئی خاندان پہ آچکی تھی۔ سامنے ٹیبل پر گرما گرم پکڑوں کی ٹرے بڑی ہوئی تھی۔

”آں ہاں پکڑے۔“ اشتر نے جلدی سے اپنی پلیٹ کو پکڑوں سے بھر اور مزے لے کر کھانے لگا۔

”واہ بھابھی واہ! آپ نے تو کمال کر دیا۔“ وہ پکڑے لکھاتا ہوا بڑی بھابھی کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ جب ریحان بھیا کی بات پہ وہ بے اختیار چونکا تھا۔

”ہتا ہے ابو، خلیل چاچو اور ان کی فیملی واپس اس شہر میں شفٹ ہو گئی ہے۔“ شفیق صاحب نے کوئی بھی تبصرہ کرنے کے بجائے سر کو ہولے سے ہلا دیا تھا۔

”چلو، اس شہر میں میں ان کی کمی رہ گئی تھی۔ نہیں میں پوچھتی ہوں۔ جب خاندان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ تو پھر یہاں واپس آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ جینا بیگم نے تو سنتے ہی غصے سے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ کو ٹیبل پر بٹاتا تھا۔

”لیک اٹ ایزی ماں۔ یہ شہر کون سا ہماری جاگیر ہے۔ مرضی ہے ان کی آگے تو آگئے۔ ہمارا ان سے پہلے کوئی تعلق نہیں تھا اب بھی کوئی لنک نہیں ہے۔“ باقر نے ماں کے کندھے کو ہولے سے دہاتے ہوئے سلی دی۔

”ہاں یہ بات تم نے بالکل ٹھیک کہی ہے۔ وہ آئیں جائیں یا کچھ بھی کریں۔ ہمارا نہ تو پہلے ان سے کوئی تعلق تھا نہ اب بھی ہوگا۔ میں تو صاف کہہ دوں گی جس جس نے انہیں بلانا ہوتا تو ہمیں بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ جینا بیگم نے پلیٹ سے سوسہ اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے یوں چبایا جیسے اپنی

ہیر وٹن کی طرح آنکھوں میں ڈھیروں آنسو بھر کر یوں راستے میں آکر کھڑی ہوئی۔ جیسے تم نے اس کی مدد نہ کی تو ڈیپلز ٹرمپ نے خود کشی کر لیتی ہے۔ اور تم۔“

احراب کے گاڑی چلاتے اشتر کی سمت منہ کر کے بیٹھا تھا اور اشتر کے لیے اپنی مسکراہٹ کو چھپانے کے لیے رخ بدل کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ یوں اس کے پیچھے چل بڑے جیسے وہ تمہارے چاچے، مامے کی بیٹی ہے جس کی مدد نہ کی تمہاری تو خاندان بھر میں ناک کٹ جانی تھی۔ یا پھر یا پھر۔۔۔۔۔۔“ احمر نے رک کر سوچنا چاہا۔ لیکن اشتر کا فلک شکاف تہقہہ اسے کچھ بھی سوچنے کے بجائے غصہ دلا گیا۔ احمر نے رک کر مصنوعی غصے سے اشتر کو گھورنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی اس کوشش میں بری طرح ناکام ٹھہرا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے میں گاڑی میں ان دونوں کی ہنسی گونج رہی تھی۔

☆☆☆

”السلام علیکم۔“ وہ جیسے ہی بارش کی پانی سے بچتا ہوا بھاگ کر لاؤنج میں آیا۔ اس کے باوجود اچھا خاصا بھگ گیا تھا۔

”بشکر ہے اشتر جتم آگئے۔۔۔۔۔۔“ جینا بیگم نے بیٹے کو دیکھتے ہوئے سکون کی گہری سانس بھری۔ ”تم جلدی سے پہنچ کر کے آؤ۔ پھر سب مل کر گرما گرم پکڑے اور ساتھ میں مزے دار پودینے کی چٹنی اور گرم گرم چائے پیتے ہیں۔“ انہوں نے محبت بھری نظروں سے اشتر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پلیٹ کر لاؤنج میں بیٹھے شفیق احمد اور اپنے دونوں بڑے بیٹوں کی طرف دیکھنے لگیں جو اس وقت زور و شور سے ملکی سیاست پہ سیر حاصل گفتگو میں مصروف تھے۔

اشتر نے بھی ایک مسکراتی نظر صوفوں پہ بیٹھے نفوس پہ ڈالی اور اثبات میں سر ہلاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ ہاتھ لینے کے بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑا اپنے بالوں میں برش بھیر رہا تھا۔ جب اچانک سے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ کانچ سی دو براؤن

دیورانی کو چھاؤالا ہو۔
 ماں کا غصہ دیکھ کر اشتر ہنس پڑا تھا۔ تو شفیق صاحب نے بیٹے کو گھورا۔

”خوب بیٹا خوب۔“ ہاں جو مرضی کہتی رہے۔
 لیکن تم باپ بیٹوں کی سوئی خلیل اور اس کی فیملی پہ ہی انگلی رہے گی۔“ جینا نیگم جیسے ہی غصے سے بولنا شروع ہوئی تھیں۔ اشتر نے وہاں سے ٹھکنے میں ہی عافیت جانی تھی۔

”میں بھی نا، بھلا کیا ضرورت تھی امی کے سامنے یہ سوال کرنے کی۔“ وہ خود کو لتاڑتا ہوا سڑھیاں چڑھا آیا تھا۔ اور اب اوندھے منہ اپنے بستر پر گرا نیچے میں منہ چھپائے ہوئے لیٹا تھا۔ جب جھم سے وہ پھر اس کی آنکھوں کے پردے پر آن ٹھہری تھی۔ ”افف لواء احمد۔“ اشتر نے کہتے ہوئے زور سے اپنی آنکھوں کو بند کیا اور کروٹ بدل گیا تھا۔

☆☆☆

کل کی ہونے والی بارش کی خوشگواریت کا احساس آج بھی موسم میں باقی تھا۔ لیکن اشتر کو موسم کی خوشگواریت سے نہیں زیادہ بارش کے بعد ہونے والی گند کی اور جگہ جگہ کھڑے پانی اگلے کٹروں سے نکلتے پانی کو دیکھ کر بیزاریت ہوئی تھی۔

”یہاں تو بارش رحمت کے بجائے زحمت زیادہ بن کر آتی ہے۔“ اشتر نے بڑبڑاتے ہوئے جیسے گاڑی کا رخ یونیورسٹی کی کی مین سڑک پر موڑا تو۔ سکون کا سانس لیا تھا۔ جی سڑک کے برعکس اس میں سڑک پہ اچھا خاصا سکون تھا۔

”تو بہ ہے اشتر، تم نے طعنوں اور بڑبڑاہٹوں میں دس سانسوں کو بھی پیچھے چھوڑ رکھا ہے۔“ احمد نے ہنستے ہوئے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ اشتر اسے کوئی جواب دیتا۔ احمد گاڑی سے اتر چکا تھا۔

”ہاں تم تو جیسے وہاں جہاں بھر کی مظلوم بہوؤں کی طرح میرے طعنوں کو برداشت کرتے ہو۔“ واپسی پہ میرے ساتھ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا بندوبست کر لیتا۔“ خالصتاً ساس کے

”اڑالو بیٹا، اڑالو ماں کا مذاق۔ لیکن تمہیں وہ بے عزتی یاد نہیں ہوگی جو تمہارے چچا صاحب نے اپنی پیاری نیگم کے ساتھ مل کر ہماری کی تھی۔“ جانے کیوں اتنے سالوں کے بعد بھی جینا نیگم اپنی وہ خود ساختہ توہین نہیں بھولی تھیں۔

”امی! جانے دیں پلیز۔ گزرے وقت کو چھان چھان کر اس میں سے بری یادوں کو نکال کر اس پہ کڑھنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ ماشاء اللہ، ہم اپنے گھر میں خوش و خرم ہیں۔ یہی بہت ہے۔ اور تم سناؤ تمہاری یونیورسٹی کیسی جا رہی ہے؟“ ماں سے بات کرتے کرتے ریحان نے اشتر کو مخاطب کیا۔

”بہت اچھی۔ بس دو ماہ رہ گئے۔ ان شاء اللہ رزلٹ آؤت ہوتے ہی مجھے نوکری مل جائے گی۔“ اشتر نے جان بوجھ کر نوکری کی بات ماں باپ اور بھائیوں کے کانوں سے گزاری تھی۔

”نوکری کیوں کرنی ہے؟ بہتر ہے تم بھی اپنے بھائیوں کی طرح اپنے خاندانی بزنس کو جو ان کرو۔“ شفیق احمد نے چائے کا سب لیتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

”خاندانی بزنس سنبھالنے کے لیے ریحان اور باقر بھائی ہیں نا۔ مجھے تو جاب کرنی ہے۔ آخر کو اتنی اچھی ڈگری لے کر میں دکان پر بیٹھتا ہوا اچھا لگوں گا۔“ اشتر نے منہ بنا کر کہا۔ تو شفیق احمد مسکرا کر رہ گئے۔

”وہ چاچو کی سب سے چھوٹی بیٹی کا کیا نام تھا؟“ جانے کیوں اشتر اس لڑکی کے نام پہ انک سا گیا تھا۔ ملے ہوئے بھی تو کتنے سال ہو گئے تھے۔

انداز میں کہہ کر اشتہر دہنی ست مڑ چکا تھا۔

اسے اپنے دائیہ کے لیے لائبریری سے چند کتابیں ایٹھ کر وانی تھیں۔ اس لیے وہ کلاس میں جانے کے بجائے لائبریری چلا یا تھا۔ کتابیں ایٹھ کر وانی کے بعد وہ قدرے سب سے الگ تھلک کونے میں رکھی میز پر کتابیں رکھنا اپنی کرسی سنبھال چکا تھا۔ جب اچانک اس کی نظر دوسری ٹیبل پر سر جھکا کر بیٹھی نواہ احمد پر پڑی۔

جو سر کو جھکائے تیزی سے اپنی نوٹ بک میں کچھ لکھنے میں مصروف تھی۔ اشتہر اپنی بس اور نوٹس چھوڑ کر مکمل طور پر اس کی سمت متوجہ ہو چکا تھا۔ جانے کیوں اسے لگ رہا تھا۔ وہ اس لڑکی کو پہلے سے جانتا تھا۔ ”نواہ احمد“ اس کے لب ہلے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن کے پردے پر اس دس، بارہ سال کی لڑکی کی شبیہ لہرائی تھی۔ جو پنگ فیراک اپنے بالوں میں دو پونیاں کیے رونی منہ بسورنی اپنی ماں کے پیچھے پیچھے پھر رہی تھی۔

چاچو کا نام اشتہر نے اپنی دو انگلیوں سے اپنی پیشانی کو مسلاتا تھا۔ خلیل احمد انصاری۔ تو کیا یہ وہی ہے جو مجھے لگ رہا ہے۔ اس نے اپنی تھوڑی کو پڑھ سوچ انداز میں کھجاتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس بار اس نے ہی نہیں بلکہ سامنے ٹیبل پر بیٹھی نواہ احمد نے بھی اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے گلابی رخسار سرخ ہوئے تھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اشتہر کی ٹیبل کے پاس آکر بڑکی تھی۔

”وہی آپ کی پرستانی ہے یہ حرکتیں بالکل بھی سوٹ نہیں کرتیں۔“ ناک چڑھا کر قدرے ٹھکی سے کہا گیا تھا۔ اور اشتہر کا جی چاہا کہ اپنا سر سامنے دیوار بھی دے مارے۔

”ایکسیوزی۔“ اشتہر کہتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ لیکن اس نے گلابی چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک بار پھر پھر کیا کہنے والا تھا بھول کر اس کے نقوش کو کھوجنے لگا تھا۔

”حد ہے بھی میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔“

آپ کی پرستانی ہے یہ گھور نے والی حرکتیں بالکل بھی اچھی نہیں لگتیں اور آپ کہہ.....“ وہ پھولتے سانس کے بیچ ذرا سانس لینے کو ٹھہری تھی۔ جب وہ جلدی سے بول بڑا تھا۔

”تم نواہ ہو ٹیبل چاچو کی بیٹی۔“ اس نے جلدی سے استفسار کیا۔ نواہ نے پہلے تو حیرت سے اپنے منہ کو کھولا اور پھر اپنی آنکھوں کو سیکڑ کر مٹھوک بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”میں اشتہر، اشتہر شفیق تمہارے تایا کا بیٹا۔“ اشتہر نے جلدی سے تعارف کروایا تو حیرت بھرے انداز میں کھلا منہ خود بخود بند ہو چکا تھا۔

زور سے گہرا سانس لے کر اپنے تئیں ہوئے اعصاب کو نواہ نے ڈھیلا چھوڑا تھا اپنا رخ کو لائبریری سے باہر جانے والے راستے کی سمت موڑ لیا تھا۔

”ارے زکو تو سہی۔ بتاؤ تا تم وہی ہونا۔“ اشتہر ٹیبل کے عقب سے نکل کر جلدی سے اس کے سامنے آکر بڑکا تھا۔

بڑی بڑی غلافی آنکھوں میں ڈھیروں اجنبیت لیے نواہ نے اپنے گھنیری پلکوں کی چٹکن کو مگر دیا تھا۔ اشتہر نے گہری سانس بھری اور پھر مکمل کر مسکرایا۔

”بیچ میں ہر کسی لڑکی کو تھوڑی میں گھور گھور کر دیکھتا ہوں۔ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو ذہن میں کچھ کلک سا ہوا تھا جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ لاسٹ ٹائم میں نے تمہیں دس سال پہلے تم چھوٹی سی فیراک پہنے، امی کا دوپٹا تھاے روٹے ہوئے دیکھا تھا، بچی تھیں اب تو خیر.....“ اشتہر نے رُک کر ایک سناٹھی نگاہ اپنے سامنے کھڑی نواہ پر ڈالی تھی۔

”پلیز اشتہر بھائی! جب ہمارے بڑے ہی آپس میں نہیں ملتے.....“ اپنے لبوں کو دانتوں سے چکاتی اور اپنی مڑوٹی انگلیوں کو مروڑتی جیسے ہی اس نے اشتہر کو بھائی کہا تھا۔ اشتہر بے اختیار ہی اپنی جگہ

جان اور ان کی فیملی بھی ہے۔“ اشتر نا جانے اس سے کیا جاننا چاہتا تھا۔
نواء نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اور پھر مسکرا کر سر کو جھکا لیا تھا۔

☆☆☆

”بابا تایا جان کو بہت یاد کرتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں افسردگی اشتر سے جتنی کب تھی۔
”کیا تایا جانے کبھی میرے بابا جان کو یاد کیا ہے۔ وہ اب اپنی بڑی بڑی کاچی سی آنکھوں کو اشتر کے چہرے پر گاڑھے ہوئے بولی تھی۔

چند لمحے اپنے سامنے بڑے جوس کے گلاس کے کناروں پہ اپنی انگلی کو پھیرتے ہوئے اشتر نے کچھ سوچا۔ اور پھر اپنی نظروں کو اٹھا کر اس ملائمت بھرے چہرے پہ بے ایک نگاہ کی۔

”چچا کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ امی ابو کتنے مان اور نیار سے سے اسبابی کا رشتہ لینے کے لیے گئے تھے۔ اور تمہارے بیڑنٹس نے کیا کیا تھا۔ صاف انکار ہاتھ میں تھما کر واپس بیج دیا تھا۔ کوئی تو لحاظ رکھتے خاندان بھر کے سامنے ابو کو کسی سبکی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس پر مستزاد فوراً بچانے اپنے حصے کا مطالبہ کر دیا۔ کتنا مشکل تھا، ایک دم ہی ان کے مطالعے کو پورا کرنا۔ جلتے کاروبار کے حصے بخرے کرنا آسان تھوڑی تھا۔ ایک لمبا پراس ہوتا ہے اسے گزرنے کے بعد ہی درستی حصہ ہاتھ میں آتا ہے۔ لیکن چچا جان تو جیسے بے یقینی کے ٹھوڑے پر سوار طرح طرح بہانوں کے ساتھ روز آلو کی دکان پہ آ جاتے اور وہی ڈھاک کے تین پات، میرا حصہ دیں، ورنہ تو مجبوراً مجھے کیس عدالت میں لے جانا پڑے گا۔“ اشتر بولنے پہ آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔ اور بے جاری نواء چہرے پہ شرمندگی سجائے اپنے بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے میز کی چٹائی پر کھرتے میں مصروف تھی۔

”جانتی ہوں۔ ابونے بھی بہت غلط کیا اور بعد میں وہ اپنے کیے بہ شرمندہ بھی تھے۔ اور پچھتاوے میں گھرے رہے۔ لیکن تایا، تائی نے کون سا اچھا کیا

سے اچھل کر رہ گیا تھا۔
”خدا کا خوف کرو۔ مضی منی کا کی تم سے ایک دو سال ہی بڑا ہوں۔ اور تم مجھے اشتر بھائی کہہ رہی ہو۔“ نواء کے یوں بھائی کہنے پر اشتر اچھا خاصا چپ سا گیا تھا۔ ”میری اماں بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ ہمارے چچا کی فیملی نے ٹھیک نہ ہونے کی قسم کھائی ہوئی ہے۔ جس دن وہ ٹھیک ہو گئے نا تو نظام کائنات میں زلزلہ آ جاتا ہے۔“ کہتے ہوئے اشتر پلٹا اپنی چیزوں کو سیٹا اور راستے میں کھڑی نواء کے قریب آ کر ڈکا۔

”تم مجھے اشتر کہہ سکتی ہو۔“ کہتے ہوئے اس نے اپنے ماتھے پہ آتے سبکی بالوں کو ہاتھ سے ہچھے کیا۔ اور پھر دین دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ باہر نکلنے سے پہلے اشتر نے پلٹ کر نواء کی طرف دیکھا جو اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مسکراہٹ نے بے اختیار ہی اشتر کے لبوں کو چھوا تھا اور اسی پل اس کے ہونٹوں پہ بکھری وہ مسکراہٹ نواء کے لبوں پہ سج گئی تھی۔

☆☆☆

بڑوں کی لڑائی میں بھی نہ چاہتے ہوئے وہ دو لوگ یوں اچانک مل جائیں گے اس کی خبر ان کے گھر والوں کو کیا خود انہیں بھی نہیں تھی۔ اور یہ اس روز پونیورسٹی میں ملنے کا آخری دن نہیں تھا۔ بلکہ اب تو اکثر ہی وہ دونوں آتے جاتے سلام دعا کرنے لگے تھے۔ اور پھر اس دن نواء کی کلاس آف تھی اور اس کی دونوں دوستیں بھی چھٹی پہنچیں۔ جب اشتر نے اسے اپنے ساتھ کینٹین چلنے کی آفر پیش کی تھی۔ بہت انکار کرنے کے باوجود بلا آخر اشتر نواء کو کینٹین میں لے ہی آیا تھا۔ فریش جوس کا آرڈر دینے کے بعد اشتر نے نواء طرف دیکھا جو ذرا سا رخ موڑے کھڑکی سے باہر نظر آتے منظر میں جانے کیا کھون رہی تھی۔ دفعتاً ہی نواء نے اپنا چہرہ موڑا اور اشتر کی طرف دیکھا۔

”تایا جان کیسے ہیں؟ اور تائی جان؟“

”ٹھیک ہیں۔ تو پتا ہے تمہارے تایا جان، تائی

”اور یہاں یونیورسٹی میں آنے کی اجازت کیسے مل گئی۔ ہمارے خاندان کی لڑکیاں فیشن میں بے شک شہر بھر کی لڑکیوں کو پرے چھوڑ دیں لیکن بڑھائی کا شوق انہیں چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ تمہارے معاملے میں یہ معجزہ کیسے ہوا؟“ وہ اپنے نوٹس سمیٹتے ہوئے سوال کر رہا تھا۔

”بس ہو گیا معجزہ۔ مجھے بڑھنے کا شوق تھا۔ اور میرے اس شوق کو ابو اور صادم بھیانے پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہی وجہ ہے میں آج اس وقت یہاں ہوں۔“ وہ کہہ کر مسکرائی تھی۔ اور اسے مسکراتا دیکھ کر اشتر کا دل جانے کیوں تیز دھڑکنے لگا تھا۔

”اے چپ دس سال کی چھڑی کرن کیا ملی۔ اور تو اسے دیکھ کر یوں دھڑکنے لگتا ہے جیسے سبھی دھڑکا ہی نہ ہو۔“ اشتر بندلیوں کے پیچھے اپنے دل کو خوب ڈپٹا تھا۔

اس سے پہلے کہ نواء مزید کچھ کہتی اس کے عقب میں انعم اور عمیہ کا سر ابا بھرا تھا۔ جو اس کی تلاش میں کب سے ماری ماری پھر رہی تھیں۔

”یہ میڈم آپ کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ اور ہم ہیں کہ یونی کی خاک اس کی تلاش میں چھانتے پھر رہی ہیں۔ انعم نے ہاتھ میں پکڑا جڑ نواء کے کندھے پہ مارتے ہوئے کہا اور گرنے کے سے انداز میں اس کے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”جلدی سے جوس آرڈر کر دو پار۔ دل ہے کہ بھڑک کر باہر آنے والا ہے۔ پھر نہ کہنا ہائے عمیہ، مرنے سے پہلے ایک بار تو اپنی آخری خواہش کا اظہار کر دیتی۔ کم سے کم جوس لی کر ہی مر جاتی۔“ عمیہ نے اتنے دل سوز لہجے میں کہا تھا۔ کہ نواء بے چاری میج میں گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی۔

”او کے۔ آپ فرینڈز بیٹھیں، میں چلتا ہوں۔“ کہتے ہوئے اشتر نے اپنے سامنے پرے جوس کے گلاس اٹھا نا ہی چاہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی انعم گلاس اچک کر منہ سے لگا چکی تھی۔

تھا۔ اگر اسبابی کا رشتہ لینا ہی چاہتے تھے۔ کم سے کم ایک بار تو اشارے کتابوں میں بات تو کرتے۔ اور پھر جب اسی اور بابا کو لگا آپ لوگوں کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تو خالہ کے ہاں اسبابی کے رشتے کی ہاں کر دی۔ اور جس دن خالہ ہمارے نکھالی رشتے داروں کے ہمراہ شادی کی تاریخ لینے کے لیے آچکی تھیں جب تانی نے اس بات کو منہ سے نکالا۔ تو ظاہر سی بات ہے اس وقت ایسی بات پہ انکار سننا تھا۔ اور اس انکار کو ہمیشہ کی طرح تانی نے اپنی بے عزتی سمجھا اور وہ تایا جان کے ساتھ دل کر وہ ہنگامہ برپا کیا کہ سب ہی خاندان کے لوگوں نے بنا ٹکٹ کے خوب ہمارا تماشا دیکھا۔ اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے ہر تعلق بھی توڑ دیا تھا۔“ نواء کے لہجے میں تاسف اور دکھ تھا۔ تو وہیں اشتر کا سر دھیرے سے اثبات مل گیا تھا۔

اس ساری صورت حال کی وجہ ہمارے خاندان میں تعلیم کی کمی کا ہونا ہے۔ پیسے کی کمی نہیں تھی لیکن شعور اور تعلیم کی کمی ہمیشہ سے ہمارے خاندان کا حصہ رہی ہے۔ ذرا سی بات ہوئی نہیں لے کر اپنی انا کا مسئلہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور مزے کی بات ہے دونوں فیملیز کے سربراہوں نے بھی اس خود ساختہ انا کی جنگ کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ سینے پہ فخر یہ انداز میں سجائے بیٹھے رہے۔ انہم۔“ اشتر نے ہنکارا بھرا۔ اور غصے میں سامنے پڑا گلاس اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

”نیک کہہ رہے ہو تم اشتر۔“ اس کی بات کی تائید کی گئی تھی۔

”ویسے تم یہاں۔“ گلاس کو لیوں سے پرے ہٹاتے ہوئے اس نے ابرو اچکا کر در یافت کیا۔

”نیا شہر، نئے لوگ، نئے راستے بھی بھی ہمیں راس نہیں آئے۔ کہیں بھی چلے گئے لیکن اپنے شہر سے بابا کی محبت بھی کم نہیں ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے ان کے کہنے پہ ہم پھر یہاں چلے آئے۔“ کہتے ہوئے نواء نے چھوٹا سا کھونٹ بھرا۔

”ہائے جس بی کر ذرا دل کو سکون آیا ہے۔ اور ذرا سی آنکھیں بھی کھلی ہیں۔“ انعم نے کہتے ہوئے اپنے ہونٹوں کے کناروں کو ٹٹو سے صاف کیا اور کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر بڑے بے تابانہ انداز نواہ کی طرف دیکھا۔

”شکر یہ مادام۔ آپ نے مجھے رزق کی بے حرمی کرنے سے بچا لیا۔“ اشتر نے ذرا ساجک کر سینے پر ہاتھ رکھا تھا۔

”مطلب۔“ انعم چوکی تھی۔ ”مطلب تو بس یہی جس پینے کا موڈ نہیں تھا۔ آپ نے میرا بتایا جو بی کر مجھ پر احسان عظیم کیا ہے۔“ اشتر نے جتنے مزے سے کہا تھا۔ انعم کا منہ کیا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

”اولو! میں بھی وہ نواہ کا گلاس ہے۔“ انعم نے روہاسی ہو کر ان تینوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر ان تینوں کا مشترکہ تہقہہ کہیں میں گونج اٹھا تھا۔

☆☆☆

یہ زندگی بھی کیا عجیب شے ہے پھنڑے لوگوں کو یوں اچانک سے سامنے کھڑا کر دیتی ہے کہ کبھی بھی یقین کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی تو یہ پھنڑے لوگ زندگی میں دل میں یوں دھڑلے سے آن بیٹھتے ہیں جیسے برسوں سے یہیں مقیم ہوں۔ خاندانی جھگڑوں، ناراضی، ملنے کی کوئی صورت نظر نہ آنے کے باوجود اشتر اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے سامنے اپنے دل کے حال بیان کر رہا تھا۔ اور نواہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھی کر چپ چاپ گلاس کے چوں کو توڑ رہی تھی۔

”کچھ تو کہو نواہ پلیر، میں تمہارے ساتھ ٹائم پاس کر رہا ہوں اور نہ ہی کوئی دل لگی۔ میں سچ میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے بے تابی سے کہا تھا۔

”یہ ممکن نہیں ہے اشتر۔“ اس کا لہجہ نازل تھا۔ لیکن کانچ سی آنکھوں پہ گری گھنیری پلکوں کی

لرزش اشتر سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

”یہ میرا ہیڈک ہے کہ مجھے اسے کیسے ممکن کرنا ہے۔ لیکن پلیر۔۔۔۔۔“ اس سے پہلے کہ اشتر اپنی بات کو مکمل کرنا۔ نواہ نے اپنی آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

”کیوں مجھے جاگتے میں وہ خواب دکھا رہے ہو اشتر۔ جو کبھی سنوں میں بھی ممکن نہیں ہیں۔ ہمارے گھر انوں کی ایک دوسرے سے بے زاری اور مخالفت کسی سے چھپی ہوئی ہے۔ ابھی پچھلے ماہ ہی تمہاری امی اور میری امی کا سامنا ہوا تھا۔ جانتے ہو نا کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی جگہ ایک ہی فنکشن میں بیٹھنے کے لیے راضی نہیں تھیں۔ آصفہ ہماری پچھو، بیٹی کی رسم کرنے کے لیے آئے مہمانوں کو بھول کر دونوں جیٹھانی دیورانی کے ساتھ سکون سے فنکشن گزر جانے کی فکر میں بلکان تھیں۔ یہ تو تاپا ابو نے تالی کو ڈانٹ کر اور میرے ابو نے میری امی کو

جھڑک کر بٹھایا تھا۔ در نہ تو وہاں وہ الف لیلی داستان چھڑتی مجھے تو یہ فکر ہونے لگی تھی وہ لوگ آصفہ کو انگوٹھی پہنانے سے ہی انکار نہ کر دیں۔ اور ایسے حالات میں تم کہہ رہے ہو کہ تم سب ٹھیک کر لو گے۔“ نواہ کی آنکھوں سے آنسو قطرہوں کی مانند گرتے اس کا دامن بھگو رہے تھے۔ واقعی یہ سب اتنا آسان کہاں تھا۔ جتنا دیکھنے سننے میں لگ رہا تھا۔ لیکن یہ دل اس کا دل کا کیا۔ جو اس کی ہمراہی کے خواب بن چکا تھا۔ ”انہوں کے سامنے، یہ محبت ہمیں بربادی کے سوا کچھ نہیں دے گی۔ اشتر۔“ وہ اب اپنے آنسوؤں کو خود ہی ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی خیالوں میں گھرے اشتر سے مخاطب ہوئی تھی۔ ”محبت کی نہیں جانی نواہ ہو جاتی ہے۔ ہمیں محبت ہو گئی ہے۔ اگر سوچ سمجھ کر ہوتی تو شاید ہم دونوں اس غلطی کو اپنی زندگی میں شامل نہ کرتے۔ میں اب بے بس ہوں۔ میرے ایگزامز ہو چکے ہیں۔ میں تم سے مل نہیں سکتی اور دیکھ نہیں پاؤں گا یہ سوچ ہی میرے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ مجھے اس وقت

تہمارے لفظوں کے مرہم کی ضرورت ہے۔ پلیز، نا
امیدی کی باتیں نہیں کرو میں ہوں نا۔ میں دیکھنا
سب ٹھیک کر دوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اشتر نے نواہ
کے براؤن بیگ پر دھرے اس کے دو دھیا ہاتھوں کو
اپنے ہاتھ میں لیتا جا رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی نواہ
اپنے ہاتھوں کو پرنے کر چکی تھی۔

”میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ محبت کرنا
ہمارے بس میں نہیں تھا۔۔۔۔۔“ کہتے ہوئے نواہ نے
اپنے ناک کی ریش کو کھینچا تھا۔ اور دوپٹے کے پلو
سے اپنی آنکھوں کو زور سے رگڑا تھا۔ ”لیکن اس سے
آگے کا سوچنا دیوانے کا خواب ہی ثابت ہوگا۔
لوگوں کی باتیں اور طعنے تو بعد میں پہلے گھر والوں کا
ری ایکشن ہی ہمارے لیے ناقابل یقین ہوگا اور ہونا
بھی چاہیے۔ جانتے بھی ہیں ہم، ہماری فیملی برسوں
سے آپس میں نہیں ملتی، ایک دوسرے کی شکل تک
دیکھنے کی روادار نہیں اور ایسے میں ہم جملے محبت
کرنے۔۔۔۔۔“ وہ کہہ کر استہرا یہ انداز میں ہنسی مٹی۔

”مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے اشتر میں یہ سب فیس کر
سکوں۔ ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ ایک قیامت
آجائے گی۔ جب ہمارے گھر والوں کو خبر ہوگی
کہ۔۔۔۔۔“

”میرے ہمارہ لوگی۔“ اشتر نے جھک کر اس
کی کانچ سی براؤن آنکھوں میں دیکھا تھا۔ نم آنکھوں
میں تیزی سے پانی کا سیلاب سا آیا تھا۔ ”حد سے
زیادہ پروا کرنے والوں کے ہاتھ میں کچھ نہیں آتا
نواہ۔ نہ رشتوں کی مٹھاس اور نہ ہی ان کا احساس۔ بس
ایک ذہنی فریب سا سامنے رہتا ہے کہ وہ بھی نہیں
ویسا ہی چاہتے ہیں جیسا کہ ہم انہیں۔ فکر نہیں کرو۔
ہمارے گھر والے ہم سے محبت کرتے ہیں تو اپنی اپنی
اتناؤں کی جنگ چھوڑ کر ایک بار ضرور ہمارے بارے
میں سوچیں گے۔ اور ان کا فضا ایک بار سوچنا ہی نہیں
ہمیشہ کے لیے ایک کر دے گا۔“ اس نے پھر سے
امید کے کئی جملوں کو نواہ کی شفاف پھٹی پہنچا کر اس
کی ہنسی کو محبت سے بند کیا تھا۔

”اور تم مجھے اچھے نہیں لگتے۔“
نواہ نے بے چارگی سے کہا۔ تو اگلے ہی لمحے
اشتر کے لمبوں کے کناروں پہ بھری مسکراہٹ اسے
خوب خصلہ دلائی تھی۔ اس نے پاس پڑی فائل کو اٹھا
کر اشتر کے سر پہ دیے مارا۔ اور خود ہی بے ساختہ ہی
ہولے سے ہنس پڑی تھی۔

وہ بڑے دلوں کے بعد دل سے تیار ہوا تھا۔
بلیو جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پر بلیک کلر کی جیکٹ پہنے
بالوں کو جیل لگا کر کھڑکے وہ خاصا پرکشش لگ رہا
تھا۔ ہنستے ہوئے نواہ نے گہری مگر چور نظروں سے
اشتر کا جائزہ لیا تھا۔ لیکن اس کا یوں دل سے دیکھنا
اشتر سے کب چھپا ہوا رہتا تھا۔

”پیارا لگ ہوں نا۔“ جھک کر شرارتی انداز
میں دریافت کیا گیا تھا۔
نواہ نے شرما کر وہاں سے جانے میں عافیت
جانی تھی۔

☆☆☆
”واہ بھئی واہ! آج تو بیگم تم نے کمال کر دیا۔“
وہ سب رات کا کھانا کھا رہے ریحان بھائی
کھانا کھاتے ہوئے اپنی بیگم کی تعریف میں رطب
اللسان تھے۔ اور کچھ غلط بھی نہیں تھا۔ سارا بھابھی
نے واقعی میں مزیدار حلیم بنایا تھا۔ ساتھ میں براؤن
پیاز باریک کٹی ہوئی بزم مرچ اور ادھر کہ۔
”مزا آگیا بھابھی۔“

باقی بھائی نے بھی اپنی پلیٹ کو دوسری بار حلیم
سے بھرتے ہوئے تھے سر کو ہلایا تھا۔ بس ایک اشتر
تھا۔ جو چپ چاپ چھوٹے چھوٹے نواہ کو توڑ کر
اپنے منہ میں رکھ رہا تھا۔

”کیوں بھئی بر خوردار، تمہارے کون سے جہاز

نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اپنے سامنے بڑی ٹرے کو پرے سرکایا تھا اور اپنے ساتھ بیٹھی ماں کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

”لو، یہ بھی کوئی بچھنے کی بات ہے۔ جب تمہاری اولاد ہوگی۔ تب تمہیں پتا چلے گا کہ ماں باپ کے لیے تو اولاد کیا معنی رکھتی ہے۔ جینا بیگم نے اپنا دوسرا ہاتھ اٹھا کر اشتہر کے چہرے پر رکھا۔

”امی! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ ان فیکٹ آپ سے اور ابو سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔ پلیز، انکار نہیں کرنا۔ یہ میری زندگی کا سوال ہے بلکہ میری خوشی کا سوال ہے امی۔“ وہ اب ماں کے دونوں ہاتھوں کو تھامے منت بھرے لہجے میں بول رہا تھا۔

”کیا بات ہے بولو تو سہی۔“ اس کا انداز اور لہجہ جینا بیگم کو بے طرح الجھا گیا تھا۔

”مجھے شادی کرنی ہے امی۔ مجھے نواء سے شادی کرنی ہے۔ میں اس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ بس میں ہوتا تو میں بھی اس سے محبت نہ کرتا۔ لیکن امی، یہ میرے بس میں نہیں تھا۔ مجھے نہیں پتا کب کیسے اور کیوں میں محبت کر بیٹھا لیکن.....“ اشتہر کا لہجہ اس کے جذبے کی سچائی کی عکاسی کر رہا تھا اور آکھیں تو جیسے اس کے خیال سے شیشائی زدہ تھیں۔

”نوا کون نوا۔“ فوری طور پر جینا بیگم سمجھ نہیں پاتی تھیں۔

”وہ خلیل چاچو کی بیٹی۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوا تھا۔ جینا بیگم نے حیرت سے پہلے اشتہر اور پھر سامنے کرسی پر بیٹھے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ جن کی حالت ان کی حالت سے کم نہیں تھی۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم اشتہر، ہوش میں تو ہو؟“ سب سے پہلے ناگواری سے کہتے ریحان بھائی نے اپنے سامنے بڑی پلیٹ کو پرے سرکایا تھا۔ اور حتمی نظروں سے چھوٹے بھائی کو دیکھا۔

”پورے ہوش و حواس میں بات کر رہا ہوں

ڈوبے ہیں۔ جو یوں جہاں بھڑکی بیزاریت چہرے پہ سجائے بیٹھے ہو۔“ شفیق احمد کی نظریں کافی دیر سے اشتہر کا جازرہ لے رہی تھیں۔

”ہاں بھائی، کیا بات ہے۔ بار، تمہیں، تو خوش ہونا چاہیے بیٹھے بٹھائے اتنی اچھی مٹی پیشل کمپنی میں تمہیں جاب کی آفر ہوئی ہے اور تم ہو کے مندر لٹکائے یوں بیٹھے ہو جیسے کمپنی والوں نے آئندہ تمہیں اپنی کمپنی کی حدود رائج سے سے سوکوں دور رہنے کا لیٹر ایڈ کر دیا ہے۔“ ہمیشہ کی طرح باقر بھائی نے اسے ہلکے ہلکے انداز میں لٹاڑا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا تھا۔

ان دنوں وہ سخت ذہنی دباؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ نواء کے لیے آنے والا پروپوزل اسے بے چین کر گیا تھا۔ ابھی تو وہ اپنے گھر والوں سے ٹھیک سے بات بھی نہیں کر پایا تھا۔ اور ایسے میں ماموں کے بیٹے کا رشتہ نواء کے لیے آجانے سے وہ کافی ڈسٹرب ہوا تھا۔

”اللہ میرے بچوں کو میرے دشمنوں کی بری نظروں سے بچانا۔ میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ سمعیہ کی طرف میرے بچے کو مت بھیجا کریں۔ وہاں اکثر ہی آپ کی بھابھی صاحبہ کی آمد ہوتی رہتی ہے۔ لے کر اسی نے میرے بچے کو نظر لگادی ہوگی۔“ جینا بیگم کے لہجے میں متا کی فکر مندی محسوس ہوتی تھی۔

”ارے میری بھولی ماں۔ یہ نظر کا کوئی چکر نہیں۔ اصل میں بھائی صاحب یہ سوچ رہے ہیں۔

پڑھائی مکمل ہوگئی، نوکری بھی مل گئی اور گھر والی کب ملے گی۔“ ریحان بھائی نے سر کو دائیں سے بائیں گھماتے اپنے سامنے بیٹھے اشتہر کو چھیڑا تھا۔

”ہاں ہاں، میں تو خود یہی سوچ رہی ہوں۔ اسی لیے تو میں نے بوا کو بلا یا ہے کہ میرے اشتہر کے لیے کوئی خوب صورت اور پیاری سی لڑکی کا رشتہ ڈھونڈ کر لادے۔ تاکہ میں جتنے والوں کو مزید جلا سکوں اور.....“

”امی! آپ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں۔“ اشتہر

بھائی۔“ اشتر نے مضطرب انداز میں اپنے بالوں میں انگلیوں کو پھیرا تھا۔

”ممکن ہی نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ کم سے کم میری زندگی میں تو نہیں۔“ لٹی میں سر ہلاتے جینا بیگم کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

”تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔ تمہیں نہیں پتا ہماری فیملی کے ان کے خاندان کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں۔“ باقر بھائی کی تا سفاہانہ نظروں نے اس کے وجود کا طواف کیا تھا۔

”اگر محبت کرتے ہوئے ان باتوں کا خیال رکھا جاتا تو یقیناً جا میں بھائی میں نواء احمد کے پاس سے گزرتا بھی نہیں۔ لیکن یہ دل اور اس دل کے رشتے تو بس یونہی جڑ جاتے ہیں۔ ہر طرح کے حساب کتاب سے دورا ہو کر۔ ہر حساب، ہر نفع نقصان سے کا اندازہ کیے بنا۔ آپ کب چاچو کے گھر میرے لیے رشتے لے کر جائیں گے۔“ اس کے لہجے میں خمد کی آج کی تھی۔

”یہ بھی نہیں ہو سکتا اشتر۔ اور وہ لڑکی تمہیں ملی کہاں؟ خاندان میں تو میں نے اسے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ تمہیں کہاں سے مل گئی وہ؟“ جینا بیگم نے اپنے اندر اچلتے غصے کو قابو کرتے ہوئے اشتر سے سوال کیا۔

”امی! اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ مجھے کہاں.....“

”جو پوچھ رہی ہوں اس کا جواب دو اشتر۔“ جینا بیگم نے نددے تیز لہجے میں کہا۔

تو اشتر نے باپ کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا کی۔ کئی لمحے باپ کے چہرے کو دیکھنے کے بعد بھی وہ ان کے چہرے سے کچھ بھی اخذ نہیں کر پایا تھا۔

”کچھ پوچھ رہی ہوں میں اشتر، تم سے۔“ ”میری یونی میں پڑھتی ہے۔ لیکن وہ مجھ سے موسٹ جوئیر اسٹوڈنٹ ہے۔ امی ہمارا سبجیکٹ، بلاک سیکشن سب کچھ الگ ہے۔“

”ابھی تو تمہارا سبجیکٹ سیکشن اور بلاک الگ ہے تب مجھے تم یہاں بیٹھے محبت کے قصے سنارہے ہو۔ اگر اکٹھے ہوتے کون جانے، کون سی داستانیں رقم کرتے۔“

”امی! پلزز، وہ ایسی نہیں ہے۔ آپ نے جو کہنا ہے مجھے کہہ لیں۔ اسے مت کچھ کہنا۔ امی وہ بہت اچھی ہے۔ آپ ایک بار دل اسے مل کر تو دیکھیں۔“ اشتر نے جیسے منت کی تھی۔

”دیکھ رہے ہیں آپ، اسے بیٹے کے کروت۔ اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ تعلیمی اداروں کا ماحول لڑکیوں کے لیے کیا اب تو لڑکوں تک کے لیے خراب ہو چکا ہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اسے یونیورسٹی بھیجے کی، سیدھی طرح اپنے بزنس میں ڈالیں جیسے باقی کے دو بڑے بیٹے کام کر رہے ہیں۔ لیکن نہیں آپ کو تو ڈگری ہو لڈر بیٹے کا شوق چڑھا ہوا تھا۔ اب دیکھیں آپ کے اس شوق کا نتیجہ ہمارے شریکوں کی بیٹی سے صاحب زور دار عشق لڑا رہے ہیں۔“ جینا بیگم نے اپنا غصہ شوق صاحب پہ نکالا اور پاؤں کو زمین پر پختے ہوئے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں۔

”اس بات کو یہیں ختم کر دو اشتر۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ اور چلو تم سب بھی ٹھیک سے کھانا کھاؤ۔ میں خود ہی تمہاری ماں کو سمجھاؤں گا۔“ شفیق احمد نے ہاتھ کے اشارے سے باقر کو گلاس میں پانی ڈالنے کا کہا۔

ان کے کہنے پہ سب نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ مگر اشتر جوں کا توں گود میں ہاتھ دھرے بیٹھا رہا تھا۔

”اشتر۔“ شفیق صاحب نے تینہی انداز میں اسے پکارا۔ مگر وہ کچھ بھی بولے بنا اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جانے کے بجائے بائیک لے کر باہر نکل گیا تھا۔

”ابو! یہ سب.....“ ریحان نے پریشانی سے باپ کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا

ہوتے ہو۔ نہ کھانے کے لیے ٹیکل پہ آتے ہو۔ اور نہ ہی اپنی شکل دکھانے کے لیے شام کی جائے پیتے ہو۔“ سنہری ٹیک کے پیچھے سے جھانکی آنکھوں نے اشتر کے چہرے پہ لکے ہوئے سوال کیا تھا۔
”مجھے ایسے رشتے نہیں چاہئیں۔ جو میری خوشی نہیں چاہتے۔“ اشتر نے زروٹھے ہوئے انداز میں جواب دیا تھا۔

”تمہیں کس نے کہا ہم تمہاری خوشی نہیں چاہتے۔ دیکھو تو کسی بوانے تمہارے لیے کیسی خوب صورت لڑکی کا رشید دکھایا ہے۔ ارے لڑکی ہے یا کوئی بری جو راستہ بھول کر سیارے میں آ گئی۔ تم بھی دیکھو گے تو.....“ جینا ٹیکم نے بات کرتے کرتے سیاہ ٹیکل پہ بڑی تصویر اٹھا کر اشتر کی طرف بڑھائی تھی۔
”کیوں کیا امی، آپ نے ایسا؟“ اس کے لیے میں کاغذ کی تیزی تھی۔ جینا ٹیکم بھی تھیں۔ مگر جلد ہی ٹیکل بھی لگیں۔

”کیا کیا ہے میں نے؟“ انہوں نے الٹا اسی سے سوال کیا تھا۔ وہ چند لمبے لمبے خاموشی سے اپنے سامنے بیٹھے ماں باپ کی طرف دیکھتا رہا۔ اور پھر اٹھ کر جینا ٹیکم کے قدموں میں آ بیٹھا۔

”مت کریں امی، ایسا۔ پلیز بابا! انا کی جھوٹی جگ میں میری اور نواہ کی محبت کو جینٹ مت چڑھائیں۔ دل ہر کسی کے لیے نہیں دھڑکتا۔ محبت کی خوشبو بھی ہر کسی کے لیے محسوس نہیں کی جاتی۔ نواہ میری زندگی ہے۔ میری زندگی کا وہ حصہ ہے۔ جس کا ہونا میرے لیے تیز دھوپ میں برستی بارش کے جیسے، خزاں کے موسم میں بہااری رت کی مانند۔ اند میری گہری سیاہ رات میں ننھے سے جھکتے جگنو کی طرح ہے۔ میری محبت کو میری محبت رہنے دیں۔ اسے دور کر کے میری زندگی کا جوگ مت بنائیں۔ میں نہیں چاہتا اس کی جدائی میرے دل کا روگ بن جائے۔ کیونکہ اگر ایک بار دل کو یہ روگ لگ جائے نا، تو امی، کبھی سکون نہیں ملے گا۔ آپ کا بیٹا ہمیشہ بے چین رہے گا۔ میں جج میں اس سے محبت کرنے لگا

تھا۔“ فکر مت کرو۔ میں خود اشتر سے بات کر لوں گا۔“ شفیق صاحب نے تسلی بھرے لہجے میں کہا اور پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے لبوں سے لگا لیا۔
انہیں یقین تھا وہ اشتر کو سمجھائیں گے لیکن انہیں نہیں پتا تھا۔ وہ اس بار ان کا یقین غلط ثابت ہونے والا تھا۔ بالکل غلط.....

☆☆☆

وہ بے چینی اور پریشانی میں سگریٹ پہ سگریٹ پے چلا جا رہا تھا۔ اسے لگا تھا۔ اس کے بات کرنے کے بعد ایک طوفان ہے جو برپا ہوگا۔ مگر اس کے نا صرف گھر آنے بلکہ اگلے کئی دن تک گھر میں کسی نے اس سے اس بارے میں دوبارہ بات تک نہیں کی تھی۔ وہ چاہتا تھا جینا ٹیکم اس سے بات کریں بڑیں، دھمکیاں دیں۔ تا کہ وہ جواب میں انہیں اپنی ضد اور غصے سے قائل کر سکے۔ لیکن وہاں تو گہری خاموشی کے سوا دوسری کوئی بات نہیں نظر آ رہی تھی۔ اور یہی بات اشتر کو بے چین کر رہی تھی۔

”اشتر! تمہیں پاپا اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔“ وہ جو اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس کھڑا سوچوں کے گہرے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ سارا بھانجی کے پیغام پہ بری طرح جھکا تھا۔
”جی آتا ہوں۔“ اس نے گردن کو ذرا سا کھما کر اثبات میں سر ہلایا اور سگریٹ کو بجھانے کے بعد کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔

اپنے چہرے پہ دو دنوں کا ہاتھوں کو پھیرتے وہ جیسے بکھری ہوئی بے چینی کو صاف کرتا، کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر میز صیال اترا آیا تھا۔ ہلکا سا ناک گرنے کے بعد وہ جیسے ہی کمرے میں وارد ہوا۔ شفیق صاحب سے بات کرتے ہوئے جینا ٹیکم لکھے بھر کے لیے زخمی تھیں۔

”آ جاؤ اشتر۔“ خوشی ان کے چہرے سے ہی نہیں بلکہ لہجے میں بھی ہویدہ تھی۔ اشتر دروازے کو چھوڑ کر بیڈ کے قریب بڑی کرسی پہ آ بیٹھا تھا۔
”ہاں بھئی بر خوردار، آج کل تم کہاں غائب

ہوں۔ نہیں شاید عشق کرنے لگا ہوں۔ اس کا واسطہ میرے دل سے ہے۔ اور دل سے جس کی تار جڑ جائیں نا، نا چاہتے ہوئے بھی وہ ہماری کل کائنات بن جاتا ہے۔ اور آپ دونوں میری زندگی سے اسی کائنات کو نکال رہے ہیں۔ جس کے بعد میرے پاس کھوئے کے لیے پانے کے لیے کچھ نہیں بچتا امی۔ مجھ سے وہ بچھڑ گئی تو گویا سب کچھ ہی بچھڑ گیا ہے۔ پلیز، مان جائیں امی۔ ایک بار ان کے گھر چلے جائیں۔ ایک بار میری خاطر اسے چاچو سے مانگ لیں۔“ وہ ایک بار پھر ماں کا ہاتھ تھامے ان کی منتیں کر رہا تھا۔

”دیکھ رہے ہیں آپ شفیق۔ اس بار ہمیں نچا دکھانے کے لیے آپ کے بھائی اور بھابھی نے کیسی چال چلی ہے۔“

”بیٹا! اس گھر سے ہم نے پہلے بھی رشتہ بنا رکھا تھا اور جس طرح انہوں نے ہماری بے عزتی کی تھی۔ وہ بے عزتی میں تو آج تک نہیں بھول جاتی۔ ہائے، میرا بچہ کتنا معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ شریوں کی چال کو سمجھ ہی نہیں سکا۔۔۔۔۔“ جینا بیگم کہتے ہوئے اشتر کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھرا تھا۔ ”کیسے نہیں نچا دکھانے کے لیے اس بار اپنی بیٹی کو ہی میرے بچے کے پیچھے لگا دیا۔“

”فار گاڈ سیک امی۔ میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں۔“ اشتر ان کی بات پر ہنسی طرح جھنجھلا رہا تھا۔

”دیکھو اشتر! تمہاری ماں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم ان کے گھر بھی رشتہ لینے کے لیے نہیں جائیں گے۔“ شفیق صاحب کو بھی جینا بیگم کی باتیں بالکل سچ لگ رہی تھیں۔ آخر کوئی اتنے سالوں بعد واپس آنا اور پھر اس یونیورسٹی میں اپنی بیٹی کو داخلہ دلوا نا جہاں اشتر پہلے سے ہی زیر تعلیم تھا۔ شفیق صاحب کو بھی یہ پلاننگ کا ہی شاخسانہ لگ رہا تھا۔

”تو آپ نواہ کا رشتہ مانگنے کے لیے چاچو کے گھر نہیں جائیں گے۔“ اشتر نے قدرے ناراضی سے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔

”کم سے کم میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ تم اس لڑکی کی تصویر دیکھ لو۔ تمہیں پسند آتی ہے تو بس بوا سے کہہ کر بات آگے بڑھائی ہوں۔“ جینا بیگم نے باس پڑی تصویر اٹھا کر اشتر کے سامنے بڑھائی تھی۔ اشتر نے ایک شکوہ بھری نظر ماں پر ڈالی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اگر آپ نے میری نواہ سے شادی نہیں کی تو بھول جائے گا۔ میں کبھی کسی اور سے شادی کروں گا اور یہ دھمکی نہیں ہے۔ اشتر کا آپ سے وعدہ ہے۔“ وہ کہہ کر پلٹا تھا۔

”آئے ہائے کیا منہ سے اول فول کہے جا رہے ہو۔ جن ماں باپ نے تمہیں پالا، اتنا بڑا کیا آج انہیں اس لڑکی کے پیچھے لگ کر یہ صلہ دے رہے ہو۔ دیکھ رہے ہیں، شفیق آپ۔ اس بار آپ کے بھائی کے خاندان نے میرے سینے سے دل کو نکال جلا کر خاک کر ڈالا ہے۔ جینا بیگم نے باقاعدہ آنسوؤں سے روتا شروع کیا۔ تو اشتر نے وہاں سے چلے جانے میں ہی عافیت جانی ہے۔ یہاں تک کہ شفیق صاحب کی آواز کو نظر انداز کرنا ان کے کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

”اگر نواہ مجھے نہیں مل سکتی تو میں بھی کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کروں گا۔“

ضدی لہجے میں سوچتے ہوئے اپنے بیڈ پر گرتے ہوئے اشتر نے منہ پہ تکیہ رکھ لیا تھا۔ اور کتنی ہی دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے وہ بالآخر سونے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

☆☆☆

”نواہ، نواہ۔۔۔۔۔“

خلیل احمد کی حیر آواز لاؤنج میں گونجی تھی۔ اپنے کمرے میں بڑھتی ہوئی نواہ گھبرا کر باہر آئی تھی۔ وہیں نواہ لاؤنج میں موجود صوفوں پہ بیٹھے شفیق احمد اور جینا بیگم کو دیکھ کر اپنی جگہ ساکت ہوئی تھی۔

”کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب؟“ خلیل

صاحب نے دھاڑتے ہوئے پتھر بنی نواہ کو بازو سے کھینچا اور درمیان میں لاکر کھڑا کیا۔

نواہ تو کاٹو تو بدن میں خون نہیں کے مصداق ڈر کر خود میں سمٹی تھی۔

”دیکھو گھر والے ایک دوسرے کی شکلیں نہیں دیکھنا چاہتے اور یہ دونوں چلے ہیں رشتے داری بنانے۔ فرحانہ بات صاف ہے۔“

جینا بیگم کی غرور سے تنی گردن اور لبوں سے نکلتے لفظ فرحانہ بیگم اور غلیل صاحب کو طعنه و تشتر کے پتھروں تلے دباتے چلے جا رہے تھے۔ ایک تو ہٹان کے ہاتھ میں تھا کہ وہ بیٹے کے والدین تھے اور وہ دونوں ایک بیٹی کے۔ خود کا پلہ بھاری سمجھتے ہوئے جینا بیگم کے بچے کی رعوت چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

”ایک منٹ چپ۔“ شفیق صاحب نے ہاتھ اٹھا کر جینا بیگم کو مزید کچھ بولنے سے منع کیا تھا۔ اور اپنی گردن کو گھما کے اپنے سامنے کھڑی نواہ کو دیکھا۔ میروں شرٹ کے ساتھ براؤن کلر کا ٹراؤزر پہنے سر پہ اسی کے ہم رنگ دوپٹا لیے وہ سر جھکائے اضطرابی انداز میں اپنی انگلیوں کو مڑوڑی شفیق صاحب کو جانے کیوں اچھی لگی تھی۔ چھوڑی دیر پہلے کا غرور اور غصہ جانے کہاں گیا تھا۔

”ادھر آؤ۔“ انہوں نے کہتے ہوئے نواہ کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب آنے کا کہا۔ جینا بیگم تو کیا غلیل صاحب اور فرحانہ بیگم حیرانی سے شفیق صاحب کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

”ج جی۔“ نواہ نے ان کے کہنے پہ اپنے قدموں کو پس چند قدم ہی آگے بڑھایا تھا۔ آٹھوں کی پلکوں پہ اگلے موٹے موٹے آنسو کی قیمتی ٹپکے کی طرح ایک ایک کر کے اپنی جگہ چھوڑنے لگے تھے۔ خوف اس کے چہرے سے مترشح تھا۔ اس کا وجود کانپ رہا تھا۔ ”تایا جان وہ میں۔“

اس نے ذرا کی ذرا سر اٹھا کر کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر کہہ نہیں پائی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنا چہرہ دونوں

ہاتھوں میں چھپا کر رو پڑی تھی۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا کہ تایا اور تانی کھرا کر اسے اور اس کے ماں باپ کو یہ عزت کر جائیں گے۔

شفیق احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور روتی ہوئی نواہ کے قریب آن پھر رہے تھے۔

”تایا جان پلیز امیرے بابا کو کچھ مت کہیے گا۔ سب غلطی میری ہے۔“ وہ ہچکیوں سے روتی اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹائے شفیق صاحب کی منت کر رہی تھی۔

”تم جیسے ناجائز کی اتنی اچھی بیٹی کیسے ہو سکتی ہے۔“ کہتے ہوئے شفیق صاحب نے روتی ہوئی نواہ کو اپنے سینے سے لگایا تھا۔

”ہیں۔“ وقت رکا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں نے حیرت سے دک کر شفیق صاحب اور غلیل صاحب کی بہت دیکھا تھا۔ گھڑیاں ہی کیوں رکی تھیں۔ حیرت کی زیادتی سے صونے یہ بیگمی دونوں خواتین بھی بے اختیار رہی اپنی جگہ چھوڑ چکی تھیں۔

”یہ میری بیٹی ہے۔“ شفیق احمد کی بیٹی اور خیرادر غلیل احمد تم نے اس بار انکار کرنے کی جرأت بھی کی۔ ورنہ میں اس بار تمہاری ایک نہیں سنوں گا۔ زبردستی اپنی بیٹی کو اپنے گھر اپنے اشتہر کی دہن بنا کر لے جاؤں گا۔“ نواہ کے سر پہ محبت سے ہاتھ رکھے شفیق صاحب مان بھرے لہجے میں بول رہے تھے۔ ایسا مان کہ غلیل احمد کا بھی سارا غصہ اور ناراضی جانے کہاں جا کر گم ہو گئی تھی۔

”نیا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کیا ہو گیا ہے۔ ہم تو بات کرنے آئے تھے کہ۔۔۔۔۔“ جینا بیگم حواس باختہ سی آگے بڑھی تھیں۔

”ہاں تو بات ہی کر رہے ہیں نا۔ پہلے ہم رشتے سے انکار کرنے کی بات کرنے آئے تھے کہ ایسا ممکن نہیں۔ اور اب ہم رشتے کی بات کر رہے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا، ضرور ہوگا۔ تمہیں کیا کوئی اعتراض ہے۔“ کہتے ہوئے شفیق صاحب نے بارعب آواز میں اپنی بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو بے اختیار

ہی جینا پیگم کا سفر فی میں ہی مل گیا تھا۔

خود ہی سمیعہ کو فون کر کے بتاتا ہوں اور اسے کہتا ہوں۔ جلدی سے آجائے۔ تم نواہ یہاں کیوں پتھر کی مورت بن کر کھڑی ہو۔ جلدی ہے میرا فون لے کر آؤ۔“ خلیل احمد نے غلٹ بھرے لہجے میں نواہ سے کہا تو اپنے چہرے پہ ہنسرے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتی وہ مسکراتی ہوئی اندر سے خلیل صاحب کا فون اٹھالائی تھی۔

کیا لہجے ایسے بھی جادو کرتے ہیں۔ سالوں کی دوری لحوں میں بھاپ بن کر کھو گئی تھی۔ پتھر سے بھائیوں خو ساختہ ”میں“ کی قید میں برسوں کی روجوں کو چسپے اذن رہائی کیا ملا تھا۔ ہم منظر خوب صورت اور حسین لگنے لگا تھا۔ محل اور خوبصورت۔ لحوں نے وہ جادو کر دکھایا تھا جو خاندان بھر کا کوئی شخص نہیں کر پایا تھا۔

سمیعہ پیگم نے دونوں بھائیوں کے بیچ صلح کروانے کی کتنی کوشش کی مگر ہر پار کی کوشش ناکام ٹھہرتی تھی۔ اور ضد جیت جاتی تھی۔ لیکن آج تو جیسے کسی مجھے کا دن تھا۔ کچھ ہی دیر میں ریحان اور باقر اپنی بیٹی کے ہمراہ چاچو کے گھر پہنچ چکے تھے۔

اور وہ اب آنکھوں ہی آنکھوں میں خاموش بیٹھی ماں سے اشارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہ بے جاری کیا بتا تیں وہ تو خود شوہر کے بدلے روئے سے اٹشت بدنداں تھیں۔

”ارے بھئی، سب آگئے۔ اشتر کو تو کال کر لو۔“ خلیل احمد سے باتوں میں مشغول شفیق صاحب نے سر اٹھا کر کہا تھا۔

”جی پاپا جی۔“ تا بعداری سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ریحان نے اشتر کا نمبر ڈائل کر دیا تھا۔ جو پچھلی گئی کال کی طرح اس بار بھی خاموش ہو کر رہ گئی تھیں۔ اشتر نے نہ تو کسی کا فون اٹینڈ کیا تھا اور نہ ہی کسی کے پیج کا جواب دیا تھا۔

”چلو تھوڑی دیر تک پھر کرنا۔“ کہتے ہوئے شفیق صاحب نے چائے کا کپ لیوں سے لگا لیا تھا۔

☆☆☆

”ارے اب کیا کھڑے ہو کر میرا منہ ہی دیکھتے رہو گے۔ چائے پانی کا انتظام کرواؤ۔ میں ذرا ریحان باقر کے ساتھ ساتھ اشتر کو بھی فون کر کے بلاتا ہوں۔ مل لینا تم بھی شفیق احمد کے ہونہار بیٹے سے جیسے نواہ کو دیکھتے ہی میرا غصہ اور ناراضی ختم ہوگئی۔ میرے بیٹے کو بھی دیکھ کر چہیں یہی محسوس ہونے والا ہے۔“ اپنی ویسٹ کوٹ سے فون نکالتے ہوئے شفیق صاحب نے تقاضا بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں باقر، بھائی کے ساتھ ذرا پانچ دس کلو مٹھائی کے ٹوکڑے اور پھل فروٹ کی ٹوکریاں لے کر خلیل احمد کے گھر آجاؤ۔“

”ہیں۔ بابا کیا ہو گیا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ فون باقر کے ہاتھ سے گرتے کرتے بچا تھا۔

”ہاں ماں سب خیریت ہے، جلدی سے آ جاؤ۔ اور یوں کرنا آتے ہوئے سارا اور نرمی کو بھی لے آنا۔“ انہوں نے دونوں بڑی بہوؤں کا نام لیا تھا۔

”بابا! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ باقر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا ہو رہا ہے۔

”اوہو یار! طبیعت بالکل ٹھیک ہے۔ تم لوگ جلدی سے پہنچو۔ میں اشتر کو بھی کال لگاتا ہوں۔ مصروف سے انداز میں کہتے ہوئے شفیق صاحب نے فون بند کیا تھا۔

”لو بھائی، میں یہاں سب مہمانوں کو بلا رہا ہوں۔ اور تم سب ہونٹوں کی طرح منہ کھولے میرا منہ دیکھ رہے ہو۔“ شفیق صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو خلیل صاحب کو جیسے ہوش آ ہی گیا تھا۔

”ارے عاصم کو فون کرو۔ گھر میں بتایا آئے ہیں۔ جلدی سے بیکری سے کچھ کھانے کی پینے کی چیزیں لائے۔ تم بھی چلو جلدی سے جاؤ رات کے لیے کھانے کا اچھے سے اہتمام کرو۔ ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے۔ ارے بھئی! ایسا ایسے کرو پہلے اپنی ماں کو فون کر کے بلا لو۔ نہیں اچھا تم رہنے دو میں

بوسہ دیا تھا۔ تو اشتر کے لب ان کی فکر مندی پہ محل سے اٹھے تھے۔

فرزانہ بوا شفیق احمد کے دور پرے کے رشتے داروں میں سے تھیں۔ جوانی میں بیوہ ہوئیں۔ تین بچوں کو محنت مزدوری کر کے پالا۔ ان کے گھر بنائے۔ پھر اپنے بچوں کو بوا کا وجود اپنے ہی گھر میں اضافی لگنے لگا تھا۔ ریحان اور باقر کی شادیوں میں گھر کے کام کے لیے آئیں تو چھینا بیکم سے بھی رہنے کی بات بھی کر ڈالی۔ کسی خیرانی ادارے سے بہت بہتر تھا کہ وہ کسی اپنے جاننے والے گھر رہ جاتی اور قسمت میں لکھی گئی محنت کو جاری رکھ کر اپنا پیٹ پال لیتیں۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بوا۔ اصل میں آج کل آفس میں درک لو ڈاتا ہے کہ سر کھانے کی فرصت نہیں مل رہی اور یہ باتی گھر والے کہاں گئے ہوئے ہیں؟“ گھر میں بیٹسی خاموشی کی طوالت اسے پوچھنے پر مجبور کر گئی تھی۔

اس سے پہلے کہ بوا اسے کوئی جواب دیتیں اس کے نمبر پر نوا کی کال آنے لگی تھی۔ پچھلے تین گھنٹوں سے آنے والی کالز میں واحد کال تھی جسے اشتر نظر انداز نہیں کر سکا۔ ”بوا چائے۔“ وہ کہہ کر فون آن کر کے اپنے کان سے لگا چکا تھا۔

”میں نے محبت کا چہرہ نہیں دیکھا۔ میں نے محبت کی جگہ تمہیں دیکھا۔ اگر محبت کی کوئی صورت ہوئی نا تو وہ ہو بہو نوا کی صورت جیسی ہوتی۔ اگر محبت بول سکتی تو اس کا لہجہ تمہارے جیسا ہوتا۔“ وہ مدح مگر تمغیر سرگوشیاں انداز میں کہتا نوا کو خود میں سمیٹنے پر مجبور کر گیا تھا۔ کتنے بل خاموشی کے ان کے سچے آنکھڑے تھے۔ خاموشی کی زبان میں ایک دوسرے کی محبتوں کی گہرائیوں کو کھوجتے وہ دونوں جانے کون سی وادیوں میں قدم رکھ چکے تھے۔

فرزانہ بوا تو کب سے وہاں سے جا چکی تھیں۔ اور وہ نوا کے سنگ محبت کی حسین راہ گزر رہے قدم رکھ چکا تھا۔ اس سے زیادہ اس وقت کچھ بھی

وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچا تھا۔ گھر میں چھائی غیر معمولی خاموشی نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا تھا۔ اس نے اپنے سر کو جھکا اور صوفے پر بیٹھ کر ٹانگوں کو آگے کی سمت پھیلانے وہ اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے گلے میں موجود ٹائی کی ٹانٹ کو کھول رہا تھا۔ جب کہ بچن کے دروازے پر فرزانہ بی کا سراپا ابھرا تھا۔

”آگے بیٹا تم فریش ہولو۔ میں تمہارے لیے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔“ اپنے کیلے ہاتھوں کو دوڑنے سے صاف کرتیں۔ فرزانہ بوائے محبت بھرے ہنسنے میں کہا تھا۔

”نہیں بوا! مجھے کھانا نہیں کھانا۔ اگر ہو سکے تو بس میرے لیے ایک کپ چائے بنا دیں۔“

ڈنٹی تھکان اور اندرونی بے چینی اس کے چہرے سے عیاں ہونے لگی تھی۔ وہ پہلے سے کافی کمزور ہو گیا تھا۔ ماں باپ کو مٹاتے مٹاتے اب تو جیسے وہ خود سے بھی ہارنے لگا تھا۔ فرزانہ بوا کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا۔ وہ بے اختیار ہی آگے بڑھیں۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہیں اشتر کا خاموش فون بول اٹھا تھا۔ ریحان بھائی کی کال کو یکسر نظر انداز کرتا اپنے سامنے کھڑی بوا کی طرف دیکھنے لگا۔

”اشتر! میں ہوں تو اس گھر کی نوکر لیکن پھر بھی میں تمہیں یہ ضرور کہنا چاہوں گی بیٹا۔ ابھی تو تمہاری زندگی کی شروعات ہے نہ جانے زیست کے اس سفر میں انسان کو کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے بہت کچھ کھونا اور پانا پڑتا ہے۔ لیکن انسان کو اس طرح ناامید نہیں ہونا چاہیے جیسے تم ہو رہے ہو۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جو تمہارے نصیب میں لکھا گیا ہے بیٹا۔ وہ تمہیں ضرور ملے گا۔“ اشتر کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے فرزانہ بوائے فکر مندی سے اسے کہا۔ تو اشتر بے اختیار ہی بوا کو دیکھتا چلا گیا۔ ”تم میرے بیٹے جیسے ہو۔ تمہیں یوں اداس اور اندر ہی اندر کڑھتا دیکھ کر مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ خوش رہا کرو بیٹا۔“ کہتے ہوئے بوائے اس کے ماتھے پہ

رتی برابر بھی یقین نہیں آیا تھا۔
”بالکل سچ بول رہی ہو یا۔“ نواء نے منہ بنا کر کہا۔

”ایسے نہیں ہو سکتا۔ رات تو میری ان سے بات..... مم میں آتا ہوں۔“ جمہیں کچھ کہا تو نہیں انہوں نے۔ ادوانی گاڈ نواء تم مجھے ہنس ہنس کر بتا رہی ہو۔ یقیناً بابا اور امی، چاچو کے ساتھ۔ بند کرو فون میں آتا ہوں۔“ اشتر نے نواء کی کوئی بھی بات سنے بنا فون کو بند کیا۔

”بوا! گھر والے چاچو کے گھر گئے ہیں آپ مجھے بتا دو تھیں۔“ اشتر چائے لاتی بوا کو سامنے سے ہٹا کر سامنے ٹیبل پہ پڑی گاڑی کی چابی اٹھا کر تیزی سے بھاگنے کے انداز میں باہر کی جانب لپکا تھا۔

”ارے سنو تو..... میری بات تو سنو۔“ فرزانہ بوا سے آواز دیتے رہ گئی تھیں۔ لیکن وہ تو کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔

راستے میں اشتر نے کتنے ہی فون ریسمان بھائی اور باقر کے نمبر پر کیے تھے۔ بابا کا نمبر بھی کئی بار ڈائل کیا تھا۔ مگر اس بار ان میں سے کسی نے اس کا فون پک نہیں کیا تھا۔

”یہ لوگ کبھی میری اور نواء کی شادی نہیں ہونے دیں گے۔ کیا ضرورت تھی چاچو کے گھریوں سب کو مل کر جانے کی۔ اور یہ نواء، مجھے اب بتا رہی ہے۔“ اسٹیئرنگ پہ زور سے ہاتھ مارتے ہوئے اشتر نے خاصے غصے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور گاڑی کی اسپید بڑھا دی۔

☆☆☆

وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ وہاں پہ سب ہی افراد لاؤنج میں داخل ہوتے اشتر کو دیکھتے ہی سنجیدگی کی جاوڑا ڈھچکے تھے۔

”السلام علیکم!۔“ تجلّت بھرے انداز میں سلام کرتا اشتر تیزی سے لطیف صاحب کے قریب آیا تھا۔
”بابا! میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ چاچو سے کوئی بھی بات نہیں کریں گے۔ پھر بھی آپ سب

حسین نہیں تھا۔ کچھ بھی.....“ آجاؤ۔“ نواء بلاشتر بہت دیر کے بعد کچھ بولنے کے قابل ہوئی تھی۔ اشتر جو صوفے کی بیک پہ سر رکھے آنکھیں موندے اسے حضور میں اپنے سامنے مجسم دیکھ رہا تھا۔

اس کے دو لفظی بات پہ جیسے کل سا گیا تھا۔
”سچ میں آجاؤں۔ پھر نہ کہنا کیوں آئے ہو؟“
اس نے جب بھی نواء سے چاچو سے مل کر بات کرنے کی بات کی تھی۔ وہ ہمیشہ گھبرا کر رونے لگتی تھی۔

”بات نہیں کروں گا۔ تو تمہیں کیسے اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔“ وہ اس کے رونے پہ جھجلا جاتا۔

”تایا سے بات کرو نا۔ اشتر سچ میں اگر تباہ، بابا سے بات کریں گے نا۔ وہ کبھی انکار نہیں کریں گے۔ اگر تم بات کرو گے پھر تو گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔“ وہ منمناتے ہوئے لہجے میں کہتی۔

”تو ہو جانے دو۔ ہنگامہ برپا ہوتا ہے یا قیامت آتی ہے جو ہوتا ہے ہو وہ ہو جانے دو۔“ وہ روٹھے لہجے میں کہتا فون بند کر دیتا۔

”میں کیوں کہوں گی کیوں آئے ہو؟“ وہ کہہ کر کھلکھلاتی ہوئی اشتر کو خیالوں کی دنیا سے کھینچ کر حقیقت میں لے آئی۔ اب حیران ہونے کی باری اشتر کی تھی۔

”خیر تو ہے یہ اتنی خوشی لہجہ کھنک یہ شوخی۔“ وہ حیران ہوتا سیدھا ہو کر بیٹھا تھا۔

”افوہ! جب روٹی تھی۔ تب بھی غصہ کرتے۔ تھے۔ اب خوش ہوں تب بھی پوچھ رہے ہو کیوں خوش ہو۔“ اس کے لہجے کا انداز اشتر کو پاگل سا کر رہا تھا۔
”میں سچ میں آجاؤں گا۔“ وہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔

”تو میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ آجاؤ۔ دیکھو سب گھر والے آئے ہوئے ہیں۔ تایا تانی، ریسمان بھائی، باقر بھائی۔“
”جھوٹ بول رہی ہو۔“ اشتر کو اس کی بات پہ

دینا۔ لینے تو ہم رشہ آئے تھے۔ مگر اب جب لڑکے نے ہی انکار کر دیا تو بات آگے کیا بڑھا میں گے۔ ”معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے کہ شفیق صاحب نے اپنی شریک سفر کو اٹھنے کا اشارہ کیا تو اشتر بے اختیار ہی بیٹھا گیا۔

”کیا کہہ رہے ہیں بابا، آپ؟“ وہ تیزی سے چند قدم مزید باپ کی طرف بڑھا۔

”نہیں نہیں بیٹا، اب کوئی بات دہرانے کا فائدہ نہیں ہے۔ تمہارا ارادہ بدل گیا تو بات ہی ختم ہو گئی۔“ واسکٹ کی جیب پر لا پرواہی سے ہاتھ پھیرتے شفیق صاحب اسے سجدہ تھے کہ باقی کے افراد کے لیے اپنی ہی کا گلا گھونٹا دشوار ہو گیا تھا۔

”بابا۔“ اشتر کی شکل تو رو دینے کے قریب تھی۔ اور اس سے پہلے کہ بچ کے وہ کچھ کہتا۔ سامنے کمرے کے دروازے کے عقب میں چھپی نولہ کی جھلک اسے مزید کفیوز کر گئی تھی۔ جتنی آنکھوں اور لبوں پہ بکھری شرمیلی مسکراہٹ اسے مفلوک کر رہی تھی۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اسے یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

”لو بھی خلیل احمد۔ تمہیں تمہارا بدعو داماد مبارک ہو۔“ پچھو نے ہنستے ہوئے تذبذب میں گھرے اشتر کو اپنے ساتھ ہنستے ہوئے لگایا۔ اور ایک مبارک باد کا شور اٹھ گیا تھا۔ اسی وقت اشتر اور نوا کو ساتھ بٹھا کر ان دونوں کی منگنی کی رسم ادا کر دی گئی تھی۔ جتنا بیگم نے باندنا خواہستی یہی اپنی کلائی میں موجود کڑے کو اتار کر نوا کی کلائی میں پہنا دیا تھا۔

”میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ پار پلیر، زور سے میرے بازو، کلائی یا پھر گال پہ چنگی ہی بھر دو۔ تاکہ میں اس خواب سے بیدار ہو جاؤں۔“ اشتر نے جھک کر اپنے پاس بیٹھی نوا کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ جو خود بھی اس وقت حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتی بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔

محبت کی دیوی مہربان تھی تو قسمت کی دیوی نے بھی اپنے نرم و ملائم جیسے پروں میں ان دو محبت

کو ساتھ لے کر یہاں چلے آئے۔“ پریشانی سے اپنی پیشانی کو مسلتے ہوئے اشتر نے اپنے ایک ہاتھ غصے سے مٹی صورت بند کیا تھا۔

”لو بھی اشتر، مجھے لگتا ہے میں تمہارا باپ نہیں تم میرے باپ ہو۔ ارے اتنی تو ریحان اور باقر کی بہت نہیں ہوئی مجھ سے یوں سوال کریں۔ بیٹا، تم کیا چیز ہو؟“ اردو کو اچکا کر قد رے ناراضی بھرے لہجے میں دریافت کیا گیا تھا۔

”بابا! پلیز۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ سب لوگ بس گھر چلیں۔ ہم گھر میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ آپ نے جو کچھ بھی کہنا ہے مجھے کہہ لیں لیکن پلیز.....“ اشتر اچھا صارو دہانسا ہو چکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا شفیق احمد اپنے پورے خاندان کے ساتھ چاچو اور ان کی نیکی کی بے عزتی کرنے آئے ہیں۔ وہ نوا سے کتنی بھی محبت کرتا تھا۔ لیکن وہ بے بسی نہیں چاہتا تھا اس کی وجہ سے نوا بچہ اس کی نیکی کی تو بہن ہو۔

”بیٹا، بات یہ ہے کہ تم بڑھ گئے ہو۔ ٹھیک ہوتی ہے تمہاری ماں، تمہیں تو بڑھا کر میں نے جیسے اپنا پاس بنا ڈالا ہے۔ نہیں پہلے تم نے پچھلے چھ ماہ سے ہماری جان کھائی ہوئی تھی کہ تم نے نوا سے شادی کرنی ہے۔“

”تمہیں بابا! پلیز۔ نہیں کرنی نوا سے شادی؟“ آپ پلیز گھر چلیں۔“ اشتر کا بس نہیں چل رہا تھا کیسے اپنے خاندان والوں کا ہاتھ پکڑے اور انہیں چنگی بجا کر نوا کے گھر سے غائب کر دے۔

”ہیں تو کیا تم نے اب نوا سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ کل رات تک تو تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اب تم ہمیں یہ نیا ہی راگ سنا رہے ہو۔“ شفیق صاحب نے چہرے جہاں بھر کی سنجیدگی سجائے بیٹے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

”نہیں بابا۔“ اشتر نے اس بار بے تابی سے اپنی دونوں مٹھیوں کو بھینچا تھا۔

”اچھا بھی خلیل احمد۔ ہمیں معاف کر

کی آنکھوں میں بیک وقت دو خوف نظر آئے تھے۔ ایک خاندان بھر کے سامنے اپنے باپ کی بے عزتی کا خوف اور دوسرا شتر کو کھودینے کا خوف۔ یہ دونوں خوف ہی بڑے خالم بڑے جان لیوا ہوتے ہیں۔ ہماری نفرت اور انا اس کی آنکھوں میں موجود خوف کے سامنے خوف زدہ ہو گئی تھی۔ “شفیق احمد کہہ کر مسکرائے تھے۔ تو جینا بیگم نے جڑ بڑھتے ہوئے اپنے پہلو کو بدلا تھا۔

”لیکن پھر بھی میرا دل اس طرح مطمئن نہیں ہو پا رہا۔ جتنے اطمینان سے آپ بات کر رہے ہیں۔“

پہلے بھی تو ہم اس گھر میں بیٹے کے رشتے کے لیے سواری بن کر گئے تھے۔ تب تو انہوں نے ٹکاسا جواب ہمارے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ آج ابی بیبی کی خوشی کا سوال تھا۔ تو برسوں پرانی لڑائی کو بھول کر لمحے بھر میں ہمیں گلے لگا لیا۔ آپ بھول گئے کیسے اسما کی دفعہ ہمیں.....“ جینا بیگم کا لہجہ گلوگیر ہوا تھا۔

”اس بات کو گزرے بہت عرصہ بیت چکا ہے جینا۔ اور اس بات سے شروع ہونے والی بحث نے برسوں دو بھائیوں کو ایک دوسرے سے دور کر رکھا ہے۔ سمجھو اسما کی جگہ انہوں نے ہمیں نواہ کو دے کر اس بات کا ازالہ کر دیا ہے۔“

شفیق احمد نے جیسے ساری گفتگو کو سمیٹا تھا۔ لیکن جینا بیگم “اونہی“ سے کہہ کر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ چکی تھیں۔ شتر نے آنکھوں کو ذرا سا سیڑھا کر باپ کی سمت استقامت سے نظروں سے دیکھا۔ برسوں کی جی دھول کو صاف کرنے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ تو وہ ایک بار میں ہی صاف نہیں ہوئی۔ جی دھول کو صاف مٹی کو صاف کرنے کے لیے حوصلے اور ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو بیٹائی یہ تو شرعاً ہمت ہے۔ ہم نے تو اپنا فرض پورا کر دیا ہے۔ اب یہ تو تمہیں اور نواہ کو دیکھنا ہے۔ تم رشتوں کو کیسے جوڑ کر چلتے ہو۔ لیکن ہاں یہ ضرور یاد رکھنا ہم دونوں بھائیوں کے رشتے میں دراڑ تھی تو ہم پھر سے جڑ گئے۔ یہ نہ ہو

کرنے والوں کو سمیٹ لیا تھا۔ نیت۔ لکن اچھی ہو تو سب کچھ آسان ہونے لگتا ہے۔ اور پھر اس نے شتر اور نواہ کی زندگیوں میں خوشیاں جوق در جوق داخل ہونے کے لیے دستک دے چکی تھیں۔ اسی شب ان کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی تھی۔ وہ سب خوش تھے۔ بے حد خوش سب سے زیادہ شتر اور نواہ جنہوں نے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے والدین کی مرضی کے ساتھ ہی شادی کریں گے۔ اور اگر بھی ان کے والدین راضی نہ ہوئے تو وہ بھی جی جیت کے حصول کے لیے غلط راستہ اختیار نہیں کریں گے۔ اور آج وہ خود سے کیے عہد کے سامنے سرخرو ہو گئے تھے۔

”ہم اگلے ماہ کی چودہ تاریخ کو اپنی بیٹی کو پورے دھوم دھام سے لینے کے لیے آرہے ہیں۔“ نواہ کو اپنے ساتھ لگاتے شفیق احمد نے بھائی سے کہا تھا۔ بڑے بھائی کی بات پہ خلیل احمد کا سر اثبات میں ہل گیا تھا۔ اناؤں کی جنگ میں اپنے جیت گئے تھے۔ جیت جیت گئی تھی۔ شتر اور نواہ جیت گئے تھے۔ کیا ایسا ہی تھا۔ یا پھر..... یہ تو اب آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ اور وقت اب بہت قریب آنے والا تھا۔

☆☆☆

”بابا! مطلب یہ سب کیسے؟“ ریحان نے گھر آتے ہی حیرت زدہ لہجے میں وہ سوال کیا۔ جس کا جواب پچھلے کئی گھنٹوں سے خود جینا بیگم جاننا چاہتی تھیں۔ گھر سے تو شفیق احمد کچھ اور ہی سوچ کر گئے تھے۔ وہاں جا کر بھی ان کے تپور، نخوت و ورثی کا پیرا بن اڑھے ہوئے تھے۔ تو پھر اچانک نواہ کو دیکھتے ہی ایسا کیا ہوا تھا۔ کہ شفیق صاحب۔۔۔ سب ہی افراد کے چہرے پہ تجسس تھا۔ سوائے شتر کے جو صوفے کے کنارے بیٹھا ہوا۔ لیوں پہ مسکراہٹ آویزاں کیے باقی سب کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ شفیق صاحب کے لب خود بخود مسکائے تھے۔

”غصہ ناراضی مجھے خود نہیں پتا۔ کیوں میرا ہاتھ چھڑا کر گم ہو گئی تھی۔ جب میں نے نواہ کو دیکھا اس

جب ہی دروازہ کھلنے کی آواز پر نواہ کا جھکا ہوا سر مزید جھک سا گیا تھا۔
اشتر اس کے مقابل آن بیٹھا تھا۔ بے یقین سا حیرت زدہ سا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا نواہ یہ سب حقیقت ہے۔ ایسا لگ رہا ہے۔ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ حسین خواب۔ پلیر، ذرا میرے ہاتھ کی پشت پر زور سے چٹکی بھرنا دیکھو تو سہی یہ خواب ہے یا عالم حقیقت۔“ کہتے ہوئے اشتر نے ہاتھ نواہ کی سمت کیا۔ جو اس بات پہ حیرت سے منہ کھولے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

اور پھر اشتر کی نظروں میں چھپی شرارت کو دیکھ کر خود بھی مسکرا دی تھی۔ اس کے مسکرانے سے اشتر کھل کر مسکرایا تھا۔

”خوش قسمتی کا کوئی نام ہے نواہ تو وہ تم ہو۔ میری زندگی کے آسمانوں پہ چمکتا ہوا وہ خوب صورت چاند جس نے میری زندگی کو روشن کر دیا ہے۔“ خوشی سے چہرہ پھر آواز کے ساتھ کہتے ہوئے اشتر نے اپنی شیروانی کی جیب سے سرخ چٹکی ڈیٹا نکالی اور اس میں موجود خوب صورت ڈائمنڈ رنگ کو نواہ کی انگلی میں سجا دیا تھا۔

”مجھے نہیں معلوم دنیا کا خوش قسمت انسان کون ہے۔ مجھے تو معلوم ہے مجھ سے بڑھ کر اس وقت دنیا میں کوئی خوش قسمت نہیں۔ تم میرے ساتھ ہو۔ میرے پاس ہو۔“ اشتر کی محبت بھری باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ یہاں تک کہ رات نے دھیرے دھیرے سرک کر رات کے آخری ستارے کو بھی اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا۔ لیکن اشتر کی محبت کا ستارہ ابھی بھی روشن تھا۔

”بس کریں اب مجھے نیند آرہی ہے۔“ نواہ نے اپنی ناک کو چڑھاتے ہوئے جہاں لیٹے ہوئے منہ بنا کر کہا۔ تو اشتر نے گھبرا کر وال کلاک کی سمت دیکھا۔ جہاں صبح کے چار بج رہے تھے۔
”نیند تو مجھے بھی آرہی ہے۔“ اشتر نے شوشی

کل کو ہم دونوں بھائیوں کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے۔ جڑنے کے قابل بھی نہ رہے۔“ شیش صاحب نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ تو اشتر نورانی اپنی جگہ سے اٹھ کر باپ کے قریب آ بیٹھا تھا۔
”ایسا بھی نہیں ہوگا بابا۔ جڑے ہوئے یہ رشتے مضبوط ہو گئے ہیں، کبھی بھی ٹوٹنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوگا۔“ باپ کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے اشتر نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ تو شیش احمد کے ساتھ ساتھ باقر اور ریحان کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☆☆☆

چودھویں کا چاند پورے طہراق سے آسمان پہ جگمگا رہا تھا۔ اس کی روشنی ہمیشہ سے ایسی ہی تھی اشتر کو کچھ زیادہ ہی روشن لگ رہا تھا۔ روشن چاند کی دودھیا روشنی میں نہائی گھری گھری سی۔ دھیمی دھیمی سی چلتی ہوا پاس سے گزرتی تو مانو محبت کے گیت سنائی دیتی گزرتی۔ وجود میں ایسا فرحت آمیز احساس جاگتا کہ دل بے اختیار میں مسکرانے کو ضد کرنے لگتا۔ حالانکہ اس کے لب تو پہلے ہی مسکرا رہے تھے۔ خوشی اس کے وجود سے عیاں تھی۔ آنکھیں مانو اس کے وجود کو دیکھتے ہیں اور بھی روشن ہو جاتیں۔ نواہ اس کے نام کی چادر اوڑھ کر کچھ دیر پہلے ہی تو اس کے ہمراہ اس گھر میں داخل ہوئی تھی۔

لہکن بنی گھبرائی شرمائی، بچی سنوری نواہ کو مختلف رسموں کے بعد اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ نواہ کمرے میں داخل ہوئی ہر سو پھول ہی پھول ہی تھے۔ سرخ گلاب اس کی راہ گزر رہے تھے۔ غمری کے جانے کے بعد اس نے سراٹھا کر ایک طائرانہ نظر اپنے ارد گرد بچے ہوئے کمرے پر ڈالی تھی۔ پورا کمرہ گلاب کی مہک سے مہلہ تھا۔ اس نے ایک گھری سانس لے کر اس خوشبو کو اپنے اندر جذب کیا تھا۔ ڈیپ ریڈ کلر کے لیٹکے میں بیٹھی شرمائی ہوئی نواہ پہ مانو کوئی الگ ہی روپ آیا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کوئی حور راستہ بھول کر اس کمرے میں آ بیٹھی تھی۔

سے کہا۔ اور اگلے ہی لمحے ان کا کمر ان کی ہنسی سے گونج اٹھا تھا۔ محبت کی دیوی نے رنگ بھری نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھا اور اپنے قہار میں موجود محبت کو پھولوں کی صورت ان پہ چھادر کرنے لگی تھی۔ بہت ڈھیر ساری محبت۔

☆☆☆

محبتیں اعزاز کی صورت زندگی میں شامل ہو جائیں تو پھر اس احساس سے بڑھ کر کچھ بھی خوب صورت اور حسین نہیں ہوتا۔ محبت کا مان تو نواہ کے چہرے پہ حیا کی لالی بن کر ٹھہر سا گیا تھا۔ یہ ان کے ویسے کی قربیب تھی۔ لائٹ پنک اور لائٹ فیروز میکی زیب تن کیے نواہ اگر کسی ایسے کم نہیں لگ رہی تھی تو ابھی کسی شہزادے کی آن بان شان لیے اس کے ساتھ براجمان تھا۔

خاندان کے ملنے ملانے والوں کے لیے گوکہ ابھی تک نواہ اور اشتر کی شادی ہو جانا ہی باعث حیرت ٹھہرا تھا۔ سالوں کی ناراضی یوں دونوں میں ختم ہوئی تھی کہ ہر کوئی اس معجزے پہ حیران ہوا تھا۔ سالوں ایک دوسرے کی مشکلیں نہ دیکھنے والے اب ہنسنے مسکراتے ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے۔ لیکن جو بھی تھا تھا بہت خوب صورت۔ اتنا خوب صورت کہ اشتر کا جی چاہا تھا۔ وہ ان لمحوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھوں کی مٹھی میں بند کر لے۔ اتنی مغبوطی سے کہ یہ لمحے بھی گزرنے نہ پائیں

اس کی یہ خواہش دیوانے کے خواب سی تھی۔ مٹھی میں لمحوں کو بند کرنے کی خواہش پوری تو نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن خوب صورت لمحوں کو کیمرے کی آنکھ نے ضرور قید کر لیا تھا۔

لیکن کب سے خبر تھی یہ خوشیاں اور یہ محبتیں کتنی زندگی کھوا کر لاتی تھیں۔ محبت کے راگ کچے ہونے والے تھے یا پھر مدہم ہوتے ہوتے دم توڑنے والے تھے۔ ملن کے رنگ ہمیشہ کے لیے ٹھہر جانے والے تھے یا پھر موسم کی پہلی بارش کے رنگ اپنے رنگ کھو

دینے والے تھے۔ گماں سے پرے آنے والے وقت سے بے خبر اشتر اور نواہ ایک دوسرے کے رنگ بہت خوش تھے۔ ان کے ملن میں آنے والی مخالفت ان کی قسمت کے سامنے بھر بھری ریت کا گھر وندا ثابت ہوئی تھی۔ دلوں میں موجود نفرتیں تو جیسے بھی تھی یہی نہیں۔ بڑوں کی انا کی جنگ میں ان کی محبت ہاری نہیں تھی۔ جیت گئی تھی۔ لیکن تقدیر کے سامنے..... یہ تو آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔ جس سے وہ دونوں ہی بے خبر تھے۔ بہت انجان بہت بے خبر تھے۔

☆☆☆

خوشیوں کے پنڈولے میں وقت کو بتاتے اشتر اور نواہ کی شادی کو چند ماہ ہی گزرے تھے۔ جب قدرت نے انہیں دینا کے سب سے خوب صورت رشتے میں باندھنے کا انتظام کر لیا تھا۔ کچھ دنوں سے نواہ کی طبیعت گری گری سی تھی۔ جینا بیگم اسے اپنے ہمراہ ڈاکٹر کے پاس لے آئی تھیں۔ جہاں چند ضروری ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر نے نواہ کو ماں بننے کی خوش خبری سنائی تھی۔

”ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ دو دھونہا پوتوں پھلو۔“ کہتے ہوئے جینا بیگم نے نواہ کو اپنے ساتھ لپٹایا تھا۔

شرمائی لجائی ہوئی نواہ، جینا بیگم کے ہمراہ لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ پریشانی کے عالم میں یہاں وہاں چکر کاٹا اشتر تیزی سے نواہ کی سمت بڑھا تھا۔

”کیا ہوا ٹھیک تو ہو۔“

ایمی آؤڈ پوائزن ہو گئی تھی کیا۔ جوا تھی دو منٹنگ ہو رہی تھی۔“ اشتر نے نڈ حال سی نواہ کے سامنے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے ماں سے دریافت کیا تھا۔ جینا بیگم نے مسکرا کر بیٹے کی طرف دیکھا اور پھر خود میں سسٹی نواہ کی طرف جس کا چہرہ شرم سے لال ہوا جا رہا تھا۔

”بتائیں نا اور تم تو یہاں آ کر بیٹھو۔“ اشتر نے مڑ کر ماں سے کہا تھا اور نواہ کو سہارا دے کر صوفے پر

بھٹا دیا تھا۔
”کچھ نہیں ہوا نوا، بالکل ٹھیک ہے“ جینا بیگم نے ہنسنے ہوئے اپنی چادر کو تہہ لگایا اور چٹن سے نکلتی سارا کی سمت بڑھا دیا۔

”مبارک ہو شفیق صاحب۔ خدا نے ہمیں ایک بار پھر اپنی نعمت کے لیے چن لیا ہے۔ میں اور آپ پھر سے دادا دادی کے عہدے پر فائز ہونے والے ہیں۔“ جینا بیگم نے مسجد سے واپس آتے شفیق احمد کو دیکھتے ہی خوشی سے آواز لگائی تو جہاں شفیق صاحب خوشی سے نہال ہوئے تھے۔ وہی اشتر نے پہلے چونک کر ماں کو اور پھر نوا کی سمت دیکھا۔ لمحے بھر میں ماں کی بات کی تہہ تک پہنچتے ہی اشتر خوشی سے ماں سے لپٹ گیا۔

”اللہ صحت مند اور زندگی والی اولاد سے نوازے۔“ شفیق احمد نے آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھی نوا کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔ وہاں پر موجود سب ہی لوگوں کی زبان سے ”آمین“ نکل گیا تھا۔ اس دن احمد و لا میں سب ہی خوش تھے۔ سب سے زیادہ اشتر جسے ابھی سے ننھے مہمان کی آمد کا شدت سے انتظار تھا۔ اور جلد ہی اشتر کا یہ انتظار ختم ہو گیا تھا۔ جب وہ اپنی ماں اور بھائیوں کے ہمراہ نوا کو ہاسٹل لایا تھا۔

☆☆☆

آپریشن کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اور نوا کو آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا۔ جب نوا نے اپنے پاس کھڑی نرس سے اشتر سے ملنے کا کہا۔ ”آپ کا فرسٹ بے بی ہے نا۔ اس لیے آپ زیادہ کنفیوژڈ ہو رہی ہیں۔ کچھ بھی نہیں ہوگا اللہ نے چاہا کچھ ہی دیر میں آپ اپنے بے بی کے ساتھ اپنے ہسپتال سے مل رہی ہوں گی۔“ نرس نے نوا کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے مسی بھرے لہجے میں کہا تھا۔

”نہیں مجھے بس ان سے ملنا ہے پلیز۔“ نوا

اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے ملتیانا انداز میں کہہ رہا تھا۔ تو نرس نے گہرا سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے قریب کھڑے وارڈ بوائے کو اشارہ کیا۔

”نوا، میری جان۔“ اشتر بے تابی سے آپریشن تھیٹر میں داخل ہوا اور بھاگتا ہوا نوا کے قریب آ گیا اور بے اختیار ہی اشتر نے اپنے لبوں کو نوا کی پیشانی کے مثبت کر دیا تھا۔

”تم ٹھیک ہو۔“ وہ اب اس کے گالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھ رہا تھا۔ نقابست زرد رنگت اور خوف کے زیر اثر ہونے کے باوجود نوا، اشتر کی فکر مندی پر مسکرا دی تھی۔

”جی ٹھیک ہوں۔“ کہتے ہوئے نوا نے اشتر کے ہاتھ کو بائیں ہاتھ میں لیا تھا۔ اشتر نے نوا کے چہرے سے اپنی نظروں کو ہٹایا۔ اور اپنے ہاتھ کی سمت دیکھا۔ وہ اب اپنا ہاتھ سیدھا کر رہی تھی۔ اشتر کا ہاتھ بھی بے اختیار سیدھا ہوا تھا۔ وہ اب اس کے ہاتھ کی پھٹی کے ساتھ اپنی پھٹی کو ملاتے ہی تھی۔ اور پھر اشتر کے ہاتھ کی سب سے چھوٹی انگلی کے ساتھ اپنی انگلی کو ملایا پھر دوسری اور پھر تیسری۔ اپنی انگلیوں کی پوروں کو اشتر کی انگلیوں کی پوروں کے ساتھ ملائے ہوئے ایک عجیب سا سکون نوا کے اندر اتر آیا تھا۔ ہر درد، ہر خوف ہر ڈر جانے کہاں کھو گیا تھا۔

”میرے ساتھ ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے نا اشتر۔“ وہ اب ہاتھوں سے نظریں ہٹا کر اشتر کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”تمہیں کیا کوئی شک ہے نوا۔“ اشتر نے جیسے گلہ کیا۔

”میرے ساتھ ہمیشہ ایسے ہی رہنا اشتر۔ میں تم ہمارے بی۔ کتنا خوب صورت احساس ہے نا یہ۔“ نوا نے آنکھوں میں ڈھیروں رنگ سموتے ہوئے تائیدی انداز میں اشتر کی اور نگائی۔

”ہاں۔ میں۔ تم اور ہما بی۔“ اشتر کھل کر مسکرایا۔

اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو نواہ کی انگلیوں میں
پنسا کر اس کی دونوں ہتھیلیوں کو اپنے سامنے کیا۔
پھر اس نے اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے نواہ کی
ہتھیلی پر کچھ لکھنا شروع کیا تھا۔ چند سیکنڈ کے
بعد اشتر نے سوالیہ نظروں سے نواہ کی طرف
دیکھا۔ جس کے لبوں پر کائنات کی سب سے خوب
صورت مسکراہٹ بھی ہوئی تھی۔ ایسی خوب صورت
مسکراہٹ کہ جس کے سامنے جہاں بھرنی ساری
مسکراہٹیں مایہ ناز مٹی تھیں۔
”کیا لکھا ہے؟“ شرارتی انداز میں پوچھا

”گیا۔“
”اشتر اور نواہ۔“ نواہ کہہ کر کھلکھلائی تھی۔ تو
وہیں اشتر بھی ہوئے سے تھپتھپکا کر ہنس پڑا۔

اس سے پہلے کہ وہ دونوں مزید ایک دوسرے
کو کچھ کہتے۔ نرس کی آواز کہیں قریب سے ہی ابھری
تھی۔

”ایک سوڑی سر آپ باہر جائیں۔ ڈاکٹر صاحبہ
آنے ہی والی ہیں۔“ نرس نے کہتے ہوئے نواہ کی
ڈرپ کی اسپینڈ کو کم کیا۔

”ظالم سانچ۔“ اشتر نے جھک کر نواہ کے کان
میں سرگوشی کی۔ اور اُسے ڈھیروں تسلیاں دینے کے
بعد باہر آ گیا تھا۔

اگلا پورا ایک گھنٹہ اشتر کا بے چینی سے ہسپتال
کی رایداری میں ٹپٹلے ہوئے گزرا تھا۔ جینا بیگم اور
فرحانہ بیگم دونوں ہی آپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی نواہ
کے آپریشن کے خیریت سے ہو جانے کی دعا مانگ
رہی تھیں۔ نمری بھابھی بھی ان دونوں کے قریب ہی
بیٹھی ہوئی تھیں۔

”آپریشن میں اتنی دیر لگتی ہے کیا؟“ اشتر نے
زک کر جانے جس سے سوال کیا تھا۔

”آپریشن میں اتنی ہی دیر لگتی جتنی اس طرح
بے چینی سے انتظار کرنے میں دیر لگتی ہے۔ تھوڑی دیر
کے لیے بیٹھ جاؤ اشتر۔ ابھی کسی بھی وقت ڈاکٹر
صاحبہ باہر آنے والی ہوں گی۔“ نمری بھابھی نے فکر

مند سے اشتر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تو وہ پھر سے ٹی میں
سر ہلانے کے بعد ایک بار پھر بے چینی سے چکر
کانٹے لگا تھا۔

دس منٹ کے بعد ہی آپریشن تھیٹر کے باہر لگا
سرخ بلب بند ہوا تھا۔ اور پانچ منٹ کے بعد ڈاکٹر
سحرش ہنسی مسکراتی آپریشن تھیٹر سے باہر آئیں۔
”مبارک ہو بیٹا ہوا ہے۔“ قریب آتے ہی
انہوں نے جینا بیگم سے کہا تھا۔

”شکر ہے میرے اللہ کا۔ شکر ہے میرے
مالک کا۔“ جینا بیگم نے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر خدا کا
شکر ادا کیا تھا۔

”میری وائف کیسی ہیں۔“ اشتر نے ڈاکٹر
سحرش کے قریب آتے ہوئے بے تابی سے استفسار
کیا۔

”وہ بھی بالکل ٹھیک ہیں۔ کچھ دیر میں انہیں
روم میں شفٹ کر دیا جائے گا۔ اور کچھ ہی گھنٹوں میں
آپ کے بیٹے کو بھی آپ کو دے دیا جائے گا۔“ ڈاکٹر
سحرش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور ٹک ٹک کرنی
وہاں سے چلی گئیں۔

”مبارک ہو فرحانہ مبارک ہو۔ تم نانی بن گئی
اور میں دادی۔“ جینا بیگم نے ہنستے ہوئے آنسوؤں کو
صاف کرتے فرحانہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ تو وہیں
نمری بھابھی ننھے مہمان کی چیزیں سیٹ کر نرس کو
دینے لگی تھیں۔ جو ان سے بچے کے کپڑے اور کبل
لینے آئی تھی۔

اشتر نے تشکر بھری نظروں سے اپنے سر کو اٹھا
کر اوپر کی سمت دیکھا اور پھر کھل کر مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

ننھے احمد کی آمد پہ خاندان بھر میں مٹھائیاں تقسیم
کی گئی تھیں۔ اور جس دن نواہ جملہ نہائی تھی۔ اشتر
نے اس کی گوری کلائی پہ سونے کا خوب صورت
برسلٹ سجایا۔ جس پہ اے اور این لفظ کندہ تھے۔

”اے سے اشتر اور این سے نواہ۔“ اس کے
ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے محبت بھرے لہجے

میں بولا۔

خراب ہوئی۔ اور وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لائے تھے۔

”اور اے سے احمد بھی۔“ نواہ جلدی سے بولی

”آں ہاں۔“ اشتر نے اپنی آنکھوں کو ذرا سا سکیڑا۔

”احمد ہمارا بیٹا۔“ نواہ نے مصنوعی غصے سے نروٹھے انداز میں کہا تھا۔ تو اشتر ہنس پڑا تھا۔

”احمد ہمارا بیٹا، ہماری زندگی ہماری کائنات۔“ اشتر نے کہتے ہوئے سوتے ہوئے احمد کو ہاتھوں میں اٹھاتا چاہا تھا۔ لیکن نواہ نے جلدی سے اس کے ہاتھوں کو پرے کیا۔

”اپنی مشکل سے سلیا ہے۔ دو منٹ پیار کرنے کے بعد خود کو آرام سے سو جائیں گے۔ اور دو گھنٹے کے لیے مجھے جاگنا پڑے گا۔ اور ویسے بھی تانی نے کہا ہے۔ بچے کو بھی مٹی مٹی نیند سے مت اٹھاؤ۔ ورنہ وہ چڑچڑا رہے لگتا ہے۔“ نواہ نے ناک چڑھا کر فردیانہ انداز میں کہا تو اشتر سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”اور امی نے یہ کہا۔ اگر میری بیٹی کو پیار نہیں کرو گی۔ وہ کتنا چڑچڑا ہوا جائے گا۔“ اشتر نے کہتے ہوئے نواہ کے گلے میں اپنے بازو کو ڈالا۔ اور اسے اپنے قریب کیا۔

”اف اشتر! آپ بھی تا۔“ نواہ نے ہولے سے اس کے کندھے پر ہکا رسید کیا تھا۔ اور اگلے ہی لمحے اپنا سر اس کے کندھے پر ٹکا دیا تھا۔

مطمئن اور خوش ہوتے ہیں جیسے اشتر اور نواہ کے دل مطمئن تھے۔ لیکن یہ طمانیت ان کی زندگی میں عارضی سی ٹھہری تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی خراب ہونے لگا تھا۔ یا خراب ہو چکا تھا۔ یا شاید خراب ہی تھا۔ اس خراب ہونے کی خبر انہیں احمد کے ایک سال ہونے پہنچی تھی۔ جب وہ دونوں اپنے بیٹے کی سالگرہ خوب دھوم دھام سے کرنے کی تیاریوں میں تھے کہ سالگرہ سے ایک ہفتے پہلے احمد کی طبیعت

”آپ بچے کو شفا انٹرنیشنل ہاسپٹل لے جائیں۔“ ڈاکٹر عظمیٰ نے ہاتھ میں پکڑی فائل کو اپنے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ نواہ نے گھبرا کر اشتر کی طرف دیکھا۔ اشتر نے ہولے سے اس کے ہاتھ کو دبایا۔ اور ڈاکٹر کی سمت متوجہ ہوا تھا۔

”لیکن آپ اس ہاسپٹل میں احمد کو کیوں بھیج رہی ہیں۔ آپنی ٹھیک موسیٰ بخار ہے۔ اسی وجہ سے احمد سخت سست ہو رہا ہے۔ آپ خود ہی ٹھیک سے چیک کریں۔“ اشتر نے اپنی ذیلی ڈاکٹر سے کہا۔

”میں نے ٹھیک سے ہی چیک کیا ہے۔ اور آپ کو ٹھیک سے مشورہ دیا ہے۔ آپ دیر مت کریں۔ احمد کو چیک کروائیں۔ بچے میں خون کی سخت کمی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بڑا حال اور سست رہتا ہے۔ اپنی ناسی میمری ٹسلی کے لیے بچے کو ڈاکٹر ٹسلی سے چیک کروائیں۔ میں پرستنی خود ڈاکٹر ٹسلی سے احمد کے بارے میں بات کروں گی۔ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے ایک دوہم ہے جو میں دور کرنا چاہتی ہوں۔“ ڈاکٹر ٹسلی نے کہتے ہوئے نواہ کی گود میں آنکھیں بند کیے لیے احمد کے گال پہ ہولے سے چٹکی بھرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اور پھر سامنے پڑے رائٹنگ پیڈ پر کچھ لکھنے لگی تھیں۔

☆☆☆

مختلف ٹیسٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹسلی نے نواہ اور اشتر کو اپنے کمین میں بلایا تھا۔

”ڈاکٹر ٹسلی! کیا کوئی سرسلیں بات ہے۔ آپ نے احمد کو بلڈ کیوں لگانے کا کہا ہے۔“ اشتر نے بے تالی سے اپنی کہنیوں کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے ذرا سا آگے کی سمت جھکتے ہوئے بے قراری سے پوچھا۔

”آئی ایم سوری مسٹر اشتر، آپنی نوکسی بھی مان باپ کے لیے یہ بہت تکلیف دہ مرحلہ ہوتا ہے۔ جب وہ اپنی اولاد کو کسی تکلیف یا بیماری میں دیکھتے ہیں۔“

”ڈاکٹر اپلیز، بتائیں میرے بیٹے کو کیا ہوا ہے۔“ رعدے ہوئے گلے اور نرم آنکھوں کے ساتھ ڈاکٹر شمس کی تمہید کو نظر انداز کرتے ہوئے نواہ نے بے تابی سے پوچھا۔ ڈاکٹر شمس نے گہری سانس لی اور نواہ کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کی سمت دیکھا۔

”احمد کو ایک موروثی بیماری ہے۔ یعنی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونے والی بیماری۔ آپ دونوں فرسٹ کزن ہیں کیا؟ آپ نے شادی سے پہلے سے پہلے جن تک ٹیسٹ کروایا تھا؟“ ڈاکٹر شمس نے ذک کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ جن کا چہرہ حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر۔“ نواہ کی سرسراہٹ ہوئی آواز نکلی۔

”ہیملیسیا۔ احمد کو ہیملیسیا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ہر سال دس ہزار بچے اس بیماری کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت ہمارے ملک میں ایک کروڑ مائز اور ایک لاکھ بچے ہیملیسیا بیماری کے ساتھ لڑ رہے ہیں۔ مائز میں بچہ سروسائید کر سکتا ہے۔ بہترین خوراک اور نگہداشت کے ساتھ زندگی کے کاموں کو سر انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن میجر کے ساتھ یہ پاسکل نہیں ہوتا۔ اور بد قسمتی سے احمد کا ہیملیسیا میجر ہے۔ یعنی اسے ہر ماہ کسی دوسرے بچے کے خون کی ضرورت پڑے گی۔“

ڈاکٹر شمس کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہو پائی تھی کہ نواہ بے اختیار ہی اپنی پوری شدت سے رو پڑی تھی۔ جبکہ اشتر اپنے دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ ڈاکٹر شمس کی سمت دیکھ رہا تھا۔

”ڈاکٹر ہماری فیملی میں زیادہ تر کزن میرج ہی ہوتی ہیں۔ اور آج سے پہلے کسی بھی بچے کے ساتھ یہ پرابلم نہیں ہوئی تو پھر احمد۔“ اشتر نے الجھ کر بات ادھوری چھوڑی تھی۔

”ضروری نہیں ہوتا جو پہلے نہیں ہوا ہو وہ کبھی نہیں ہوتا۔“

اللہ تعالیٰ سے اپنے بچے کی صحت اور لمبی زندگی کی دعا کیجیے۔ لیکن اس وقت تو اسے دعاؤں کے ساتھ ساتھ دواؤں کی بھی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر شمس نے کہتے ہوئے گھٹکھٹکھٹا تھا۔

لیکن آزمائش کوئی چھوٹی آزمائش تو نہیں تھی۔ اور یہ آزمائش نواہ سے کہیں زیادہ اشتر کو آزمائش رہی تھی۔ اسے مشکل میں ڈال رہی تھی۔ احمد کی پہلی سالگرہ کی ساری پلاننگ دھری کی دھری رہ چکی تھی۔ ان دونوں نے ایسا کب سوچا تھا کہ ایسی آزمائش ان کے حصے میں آئے گی اور یہ آزمائش ان دونوں کے درمیان رشتے کو مضبوط کرنے کے بجائے ان کے رشتے کو کمزور کر ڈالے گی۔ محبت کی دیوی مہربان رہنے کے بجائے یوں چپکے سے منہ منڈ لے گی۔ نواہ کو اس کی خبر کب تھی۔ چند ماہ فقط چند ماہ کے بعد ہی اشتر شدید ذہنی باؤ کا شکار ہو چکا تھا۔

نواہ کو اس نے دل و جان سے چاہا تھا۔ گھر والوں کی ناراضی خاندان کی مخالفت کو ختم کرنے کے بعد وہ بہت مشکل سے نواہ کو اپنی زندگی میں شامل کر پایا۔ زندگی حسین راہ کی راہ گزر رہی جانے کے بجائے عجیب پتلی دھوپ کی راہ پر لے آئی تھی۔ راہ بھی ایسی جس میں چھاؤں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اور ایسے میں وہ دونوں ساتھ چلتے ہمراہی انجان مسافر میں بدلتے جا رہے تھے۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مینے کا آخر تھا۔ اور مینے کے آخری دنوں میں احمد میں خون کی کمی ہونے لگتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ زیادہ ضدی اور چڑچڑا ہونے لگتا تھا۔ نواہ صبح سے اسے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ جب نواہ اور احمد کو گود میں اٹھائے اپنے کمرے میں آئی جہاں ٹی وی کی آواز کا گھما دبائے اشتر اسکرین پر نظریں جمائے۔

جانے کون سے خیالوں میں گم تھا۔ جب نواہ روتے ہوئے احمد کو لے کر اس کے سر پر آن کھڑی ہوئی تھی۔

کی صورت میں اولاد عطا کی۔ لیکن آج کے بعد کبھی میرے بیٹے کو ایسے مت کہنا۔ دیکھو تو سہی کتنا پیارا ہے۔ کتنا معصوم ہے۔“ نواء نے اشتر کے سینے سے سر اٹھا کر احمد کی طرف دیکھا۔ جو چہرے پر فرشتوں جیسی معصومیت لیے سو رہا تھا۔

”ہمارا بیٹا بہت پیارا ہے۔ ہم اپنے بیٹے کی کنیہ کر کریں گے۔ اسے پیار سے پالیں گے۔“ اشتر نے آگے بڑھ کر سوئے ہوئے احمد کے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ اور پلٹ کر نواء کی طرف دیکھا جس کی آنکھیں بیک وقت اشتر اور احمد کی محبت میں جھلک رہی تھیں۔ لیکن نواء بھی یہ نہیں جانتی تھی یہ اتنا آسان نہیں ہونے والا تھا۔ سب سے زیادہ لوگوں کی نظروں اور باتوں کو برداشت کرنا تو بالکل بھی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ ضبط کرتے کرتے پتھر بننا پڑتا ہے اور ابھی نواء پتھر نہیں تھی۔

☆☆☆

احمد کو بلڈ گوانے کے لیے ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔ اشتر نے اپنی ہاف لیو جمع کرادی تھی۔ اور ابھی نکلنے والا ہی تھا۔ جب اس کا کوئی سرفراز اس کے کہین میں آیا تھا۔

”یار! تو کہیں جا رہا ہے۔“ اشتر کو لیپ ٹاپ آف کرتے دیکھ کر سرفراز نے اس سے سوال کیا۔ ”ہاں پار! آج تھوڑا کام ہے اس لیے ہاف لیو۔ تو بتا کوئی کام ہے کیا۔“ اشتر نے معروف سے انداز میں کہا۔

”یہ آڈٹ میں تھوڑی گڑبڑ ہو رہی تھی۔ تیرے پاس آیا تھا اگر تو ایک نظر دیکھ لیتا تو۔“ سرفراز نے ہاتھ میں موجود اپنا لیپ ٹاپ اشتر کی سمت نے بڑھایا۔

”سوری یار! ابھی تو بالکل بھی ٹائم نہیں ہے۔ احمد کو ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔ آئی ایم کیٹنگ لیٹ۔“ اپنی کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے اشتر نے جملت بھرے لہجے میں کہا۔ ”چل کوئی بات نہیں کل ہو جائے گا۔“ سرفراز

”اشتر! میں بہت تھک گئی ہوں۔ آپ پلیز“ احمد کو تھوڑی دیر کے لیے اپنی گود میں لے لیں۔“ کہتے ہوئے نواء نے احمد کو اس کی گود میں دینا چاہا تھا۔ جسے اگلے ہی لمحے اشتر نے ہاتھ سے پرے کیا۔ غصے سے بیڑے اتر آیا تھا۔

”پیچھے کرو اسے۔“ وہ منہ ہٹا کر بولا۔

”کیا ہو گیا ہے اشتر ہمارا بیٹا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے نواء نے روتے ہوئے احمد کو اپنے کندھے سے لگایا اور اس کی پشت پر پسلی دینے لگی۔

”تم سے شادی میں نے اس لیے نہیں کی تھی کہ ایسے بچے کو ہماری زندگی کا حصہ بنائیں۔“

اشتر کا لہجہ اور انداز دونوں ہی نواء کا دل چیر گئے تھے۔ آنکھوں کی رکیں ضبط سے جیسے سرخ ہوئی تھیں۔ تو وہیں گردن کی پھولی سبز رکیں بتا رہی تھیں وہ ضبط کی کس منزل پہ کھڑی تھی۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اشتر کو اپنے لہجے اور لفظوں کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا نواء۔“ اشتر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کو تھامنا چاہا تھا۔ جسے نواء نے آہستگی سے دور کر دیا تھا۔ احمد سوچکا تھا۔ نواء نے اسے کاٹ میں لٹایا اور جیسا ہی چلی اشتر کے سینے سے ٹکرائی۔

”اشتر! پلیز۔“ اس نے اشتر کے پیچھے کرنا چاہا۔

”ایم سوری! مجھے ایسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔“ زبردستی اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اشتر نے شرمندگی سے کہا۔ یہ اس کے لہجے میں موجود شرمندگی ہی تھی۔ نواء کے سارے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ وہ اس کے سینے پر سر رکھ روئے پہ آئی تو روٹی چلی گئی تھی۔

”میں نے بھی نہیں چاہا تھا اشتر ہماری پہلی اولاد ایسی ہو۔ ہر پل ہر دم بس یہ دعا کی تھی۔ اللہ اولاد نبی کی صورت میں دینا یا پھر بیٹے کی زندگی اور صحت والی دینا۔ اب مجھے کیا پتا تھا۔ اللہ نے آزمائش

آہستگی سے کہی تھی۔ اور پھر سے سبزی کی ٹوکری اور پرات کو اپنی سمت کھینچ لیا۔
”ہائی، احمد، اشتر کی ذمہ داری ہے۔“ ان کا انداز نواہ کو افسردہ کر گیا تھا۔ وہ محبت وہ چاہت جس کے بان پہ وہ اس گھر میں آئی تھی۔ وہ تو پیسے خواب ہونے لگی تھی۔

خوشیوں کا ہاتھ تھپاے وہ اشتر کے سنگ بنی خوشیوں کا انتظار کر رہی تھی کہ احمد کے آنے سے اس کے پاس موجود خوشیاں اور محبت دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑانے لگی تھیں۔ نواہ جیسے ٹھکنے لگی تھی۔ چھ ماہ میں ہی وہ نئی طرح خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ وہ سب کا نہیں بلکہ اشتر کا رویہ تھا۔ وہ جانتی تھی اشتر ڈنڈی دباؤ کا شکار ہو رہا ہے۔ وہ اسے گھر کا سب سے چھوٹا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ جس نے بے فکری دیکھی تھی۔ جسے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ سوائے نواہ سے شادی کرنے کے معاملے میں۔ لیکن احمد کے آنے سے وہ بے فکری اور پریشانی میں گھر کر رہ گیا تھا۔ سب کچھ ٹھیک اور من چاہا ملتے ملتے زندگی کی سب سے بڑی خوبیوں اور دھوری اور ذمہ داری کی صورت اس کے کندھوں پہ آن کرے گی اس کا اس نے تصور نہیں کیا تھا۔ اور پھر خود نواہ نے کب سوچا تھا۔ اشتر کا رویہ ہرگز رتے دن کے ساتھ اسے اداس کرتا جا رہا تھا۔

احمد کو دمٹ ہو رہی تھی۔ خیالوں میں گھری نواہ نے سر کو جھٹکا اور تیزی سے احمد کو لے کر واش بیسن کی سمت لپکی تھی۔ احمد کو صاف کرنے سے اسے کپڑے پہنانے کے بعد وہ واپس لاؤنج میں آئی۔ تو جینا بیگم بڑے اٹھاک سے ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھیں۔

”اشتر کا فون ابھی بھی آف جا رہا ہے۔ میں احمد کو لے کر ہسپتال جا رہی ہوں۔ اگر آج احمد کو بلڈ نہ لگوا یا اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔“ آنسوؤں کو اپنے اندر اتارتے وہ جینا بیگم کو بتا رہی تھی۔

نے لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یار ایک بات ہے مجھے دیکھ کر دکھ بہت ہوتا ہے۔ انسان سوچتا کیا ہے۔ ہوتا کیا ہے۔ احمد کی پیدائش سے تو کتنا خوش تھا۔ لیکن دیکھ تیری یہ خوشی کیسے استحسان بن گئی۔ اولاد اگر بیٹا ہو تو آدمی کا سینہ پوٹھی پھول جاتا ہے۔ بیٹا خاندان کے بڑھنے کی امید بنتا ہے۔ سارے ماں چہ چہ لیکن افسوس ہوتا ہے۔ دکھ ہوتا ہے۔ خیر اللہ بچے کی تکلیف سے زیادہ تمہیں ہمت اور حوصلہ عطا کرے۔“ سرفراز کے لہجے میں جانے ایسا کیا تھا۔ اشتر کا دل جیسے کسی نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو۔ آج کل ہر ملنے ملانے والا کم و بیش ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتا ہوا ملتا تھا۔

اشتر جلت بھرے انداز میں سرفراز سے ہاتھ ملانے کے بعد آفس سے باہر آ گیا تھا۔ گردل پہ ایسی باتوں کا بوجھ اتنا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اپنی گاڑی کا رخ گھر کی سمت کرنے کے بجائے اس کے مخالف سمت دوڑاتا چلا گیا۔ اس کے ٹمبر پر نواہ کی کال آ رہی تھی۔ اشتر نے ڈیش بورڈ پر رکھا اپنا فون اٹھایا اور پاور آف کر کے وہ تیز گاڑی دوڑائے سڑکوں کی خاک اڑاتا پھر رہا۔

☆☆☆

گود میں احمد کو اٹھائے دوسرے ہاتھ میں موجود فون کو کان سے لگائے نواہ لاؤنج میں یہاں وہاں بے چینی سے جھپٹتی پھر رہی تھی کہ جینا بیگم نے فی دی کا والیوم ملکا کرتے ہوئے ہاتھ میں موجود سبزی کو پرات میں رکھتے ہوئے نواہ کی سمت دیکھا۔ جو لگ رہا تھا کسی بھی وقت رو دے گی۔

”ہائی احمد کو ہسپتال لے کر جانا ہے، اور اشتر ہے کہ فون نہیں اٹھا رہا۔“ وہ بڑباہی ہو کر جینا بیگم سے مخاطب ہوئی تھی۔

”ایک کام تھوڑی ہے میرے بچے کو ہزاروں تو آفس کے کام ہوتے ہیں۔ جو اس کی جان سے لپٹے ہوئے ہیں۔ ایسے میں اب یہ ہر ماہ کی نئی ذمہ داری۔“ آخری بات انہوں نے بڑبڑاتے ہوئے

”اچھا ٹھیک ہے۔ بتا دوں گی۔“ جینا بیگم نے جیسے جان چڑھائی تھی۔
 ”جانی! میں کہہ رہی تھی۔ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو.....“ نוא نے اپنی تمام تر ہمت جمع کرتے ہوئے کہا۔

”اے! یہ بھی تم نے خوب کہی۔ لو بھلا میں کیسے جا سکتی ہوں۔ میری تو خود کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اتنا سر میں درد ہو رہا ہے کیا بتاؤں۔“ کہتے ہوئے جینا بیگم نے اپنے سر پر دو پٹا باندھا اور آگے بچھے مل کر ہائے ہائے کرنے لگیں۔ نوا نے ایک شکوہ بھری نظر اپنی ساس سے ڈالی اور دل ہی دل میں اشتر سے ناراض ہوئی۔ احمد کو کندھے سے لگائے گھر سے باہر آگئی۔ جہاں پہلے ہی اور والد اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

پھر اس دن نوا نے سوچ لیا تھا۔ احمد کی تمام تر ذمہ داری اس کی ہے۔ اور اس نے ذمہ داری کو اچھے سے نبھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ماں بھی۔ وہ اپنے بچے کو تنہا اور تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن وہ بھول گئی تھی۔ اشتر بھی باپ ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل تھا۔ ایک باپ کا دل جو وہی سب محسوس کرتا تھا۔ جو ایک ماں کا دل۔۔۔۔۔ لیکن وہ ابھی خود کے احساسات یا لوگوں کو فیس کرنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ جو ہر بار کچھ ایسا کہہ دیتے تھے کہ اشتر اندر سے ٹوٹ سا جاتا تھا۔ اور یہ ٹوٹنا اُسے کتنی تکلیف دیتا تھا یہ بس وہی جانتا تھا یہاں تک کہ نوا بھی نہیں۔

☆☆☆

”آپ نے اسے اکیلے کیوں جانے دیا؟“ اشتر نے ناراضی سے ماں سے سوال کیا۔
 ”کیا مطلب؟ کیوں جانے دیا۔ اس نے کہا احمد کو لے کر جانا ہے۔ میں نے کہہ دیا چلی جاؤ۔ نہ جانے دیتی تو کہتے میری بیوی کو کیوں نہیں جانے دیا؟“ جینا بیگم نے غصے سے اشتر کو دیکھتے ہوئے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

”امی! آپ اس کے ساتھ چلی جاتیں یا

سارا بھابھی، کم سے کم آپ ہی اس کے ساتھ چلی جاتیں۔“ اشتر نے سارا بھابھی کو مخاطب کیا۔ جو بیا کے بال بنا رہی ہیں۔
 ”کیسے چلی جاتی اشتر۔ بچوں نے اسکول سے واپس آنا تھا۔ کھانا پانا تھا۔“

”اگر آپ چلی جاتیں تب بھی بھابھی، بچھے گھر میں امی اور نرمی بھابھی تھیں۔“ اشتر نے تاسف بھری نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھا اور پلٹا۔

”اچھا، اب بیٹھ کر پانی تو پی لو۔ سکون کا سانس لے کر کھانا کھا کر چلے جانا۔ تین چار گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ تم صبح کے کھانے ابھی لوٹے ہو۔ اور.....“ جینا بیگم بیٹے کے لیے پریشان ہوئیں۔

”امی پلیز،“ اشتر نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ اور تیزی سے باہر کی سمت بڑھ گیا۔
 ”اب اس میں بھی ہم ہی تصور دار ٹھہرے۔ کل چلی جاتی بچے کو لے کر لیکن نہیں جاتا ہے تو آج ہی جاتا ہے۔ پھرے بچے کو پاگل بنا رکھا ہے۔“ جینا بیگم کی بڑبڑاہٹیں عروج پر تھیں۔ اس سے پہلے کہ غصہ کسی نہ کسی بات پر سارا پکرتا اس نے بیا کو وہاں سے لے جانا ہی بہتر سمجھا تھا۔

☆☆☆

کوئی دھیرے سے اس کے پاس آ کر بیٹھا تھا۔ سر کو جھکا کر بیٹی نوا نے اپنی گردن کو ذرا سا موڑا اور اپنے پاس بیٹھے اشتر کی سمت دیکھا۔
 تھکاوٹ اس کے چہرے کے ہر نقش سے عیاں تھی۔ اس کے چہرے کو دیکھتے ہی نوا کو اپنی ساری ناراضی ختم ہوتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔ اسے اس چہرے سے بہت محبت تھی تو پھر کیسے وہ اس سے ناراض رہ سکتی تھی۔ نوا نے دھیرے سے اپنا سر اشتر کے کندھے پر رکھ دیا۔

احمد کو دیکھتا اشتر چونکا۔ اور پھر اپنے ہاتھ کو نوا کی گود میں رکھے اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک ایک کر کے اپنی اگلیوں کو اس کے ہاتھ کی پشت پہ

رکھتے ہوئے وہ نواز کے ہاتھ کو ٹٹھی کی صورت اپنے ہاتھ میں بھر چکا تھا۔

”گھر ہوتی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے اللہ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ ہمارے خاندان میں بھی کوئی ایسا پیار بچہ نہیں ہوا۔ تو پھر ہم ہی کیوں.....“

یہ ہر وقت کیوں کی گردان مجھے تھکائے رکھتی ہے۔ اشتر۔ لیکن جب بھی ہر ماہ احمد کے ساتھ اس ہاسپٹل میں آتی ہوں۔ تو یہاں لوگوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے۔ صرف میں ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگ ہیں۔ جو اس مشکل سے گزر رہے ہیں۔ آج میں نے ایک بچے کو دیکھا۔ بلڈ گٹنے کے باوجود ہنستا مسکراتا۔ اس کی ماں کے چہرے پر اسے خوش دیکھ کر جو خوشی تھی نا اشتر وہ بہت قیمتی تھی۔ بہت پیاری۔

ایک ماں کا بچہ پیار ہی سہی۔ اس کے پاس تو ہے۔ زندگی میں تو سب ہوتا ہے۔ خوشی بھی غم بھی۔ پھول ہیں تو کانٹے بھی۔ درد ہے تو مسکراہٹ بھی۔ تو ہم ہمیشہ آسمان اور اچھی چیزوں کو ہی چننا پسند کرتے ہیں۔ کبھی بھی درد کانٹے اور یہ غم زبردستی ہمارے حصے میں آتے ہیں۔ تاکہ ہم خوشی کو محسوس کر سکیں۔ اس کی مرضی ہے۔ اشتر وہ کیسے کب کیا دیتا ہے۔ اس کی رضا میں راضی ہونا چاہیے ہوں۔ کبھی میرے لیے یہ سب اکیلے کرنا بہت مشکل تھا۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ ہم دونوں مل کر اپنے بٹے کی کتیر کر سکتے ہیں۔ اس طرح پریشان ہو کر پریشانی کو مت بڑھاؤ۔“ نواز کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی۔ اور اشتر کے سامنے آ بیٹھی۔

”نواز میں.....“ اشتر نے کچھ کہنا چاہا۔

”میں جانتی ہوں اشتر تم بھی احمد سے بہت محبت کرتے ہو۔ لیکن گھبراؤ مت۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ لیکن تم میرے ساتھ ہونا۔“ نواز نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

”میں تمہارے ساتھ ہی ہوں نواز۔“ اشتر کہہ کر مسکرا دیا تھا۔ اور اسے یوں مسکراتا دیکھ کر نواز

مسکراتی تھی۔

”تم بہت بُرے ہو۔“ نواز نے اس کے ہاتھوں کو چھوڑتے ہوئے کھڑے ہو کر کہا۔ تو اشتر کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

”ہاں بُرا تو میں ہوں اور بہت بُرا ہوں۔“ نواز کے چہرے کو اپنی نظروں کے حصار میں لیتے اشتر نے کہا۔ اور اٹھ کر نواز کے قریب آیا۔

”زیادہ شوخ مت بنو۔ یہ ہاسپٹل ہے۔“ نواز نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے ڈراسا پیچھے کی جانب دھکیلا اور گھورا۔

”تو سچ ہے یا ر، کتنی ظالم بیوی ہو تم۔“ اشتر نے نواز کی ناک تھپکی۔

”تم نے کچھ کھایا تھا۔ یا ایسے ہی بھوکے پیٹ آئی ہو؟“ اشتر نے فکر مندی سے دریافت کیا۔ نواز کچھ نہیں بولی تھی۔

”ننتی بار کہا ہے نواز اپنے کھانے کا دھیان رکھا کرو۔“ اشتر نے اسے ڈنپا۔ اور پھر اس کے لیے ہاسپٹل کی کینٹین سے کچھ کھانا لانے کے لیے کمرے سے باہر چلا گیا۔ نواز نے محبت سے اشتر کی پشت کو دیکھا۔ اور پھر سوئے ہوئے احمد کی پیشانی پر اپنے لبوں کو رکھ دیا۔

☆☆☆

زندگی کا یہ کڑوا سچ مشکل سے سہی نواز اور اشتر نے قبول کر لیا تھا۔ وہ دونوں اپنے ارد گرد کے لوگوں کی باتوں کو نظر انداز کرنا سیکھ گئے تھے۔ ہاسپٹل آتے تو ہنستا کتنے ہی لوگ اس پیاری کے ساتھ لڑکے چنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ ہر ماہ کا آخر ایسے مریض کے لیے کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہوتا تھا جب ان کا جگر خون بنانے سے انکار کر دیتا۔ اگر خون بننا بھی تو اتنا کم کہ چنے کے لیے ناکافی ہوتا۔ کبھی کسی کے خون میں سفید خلیوں کی کمی رہ جاتی۔ تو بھی سرخ خلیے نہ ہونے کے برابر۔ نواز اور اشتر اس سب سے کب آگاہ تھے۔ ہر ماہ ہاسپٹل سے گھر آنے کے بعد وہ دونوں شکرانے کے نفل پڑھتے تھے۔ کہ خدا نے

انہیں صحت مند زندگی سے نوازا تھا۔ ان میں ایسا کچھ خاص نہیں تھا۔ جو وہاں پہ موجود مریضوں میں نہیں تھا۔

اور ہم سب اس کی مرضی کے سامنے بے بس تھے۔ بہت بے بس۔ لیکن بھی بھی خدا اس نے کسی کو ختم کرنے کے اسباب بھی بنا دیتا ہے۔ گھب اندھیرے میں امید کے جگنو کی چھوٹی سی کرن بھی راہوں کو منور کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور ایک ایسی ہی کرن نواء کی زندگی میں جاگتی تھی۔ جب ڈاکٹر دانیال نے لندن سے آنے کے بعد شفا ہسپتال کا چارج سنبھالا تھا۔ احمد کے کیس کی فائل ان کے ٹیبل پہ تھی۔ اور پھر اگلے دن ہی انہوں نے اشتر اور نواء کو ہسپتال آنے کا کہا تھا۔ اشتر شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ اشتر سے اجازت لینے کے بعد وہ ڈاکٹر دانیال سے ملنے کے لیے ہسپتال آگئی تھی۔

”میں آ سکتی ہوں۔“ نواء نے ڈاکٹر دانیال سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

”جی، جی آف کورس۔“ ڈاکٹر دانیال نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے نواء کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔

”مسز اشتر! ہیو آ سیٹ۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے انہوں نے اپنی ٹیبل کے سامنے بڑی کرسی کی سمت اشارہ کیا۔ اور خود بھی اپنی کرسی پہ بیٹھ گئے۔

”احمد کیسا ہے؟“ ڈاکٹر دانیال نے پوچھتے ہوئے اپنے سامنے موجود گلاس سے ڈھکن اتارتے ہوئے نواء کے سامنے رکھا۔ اور خود کرسی کی بیک سے ٹیک لگائی۔

”جھنجک یو۔“ نواء نے چند گھونٹ پانی کے پی کر گلاس ٹیبل پہ رکھا۔

”احمد ٹھیک ہے۔ گرمی زیادہ تھی میں اس لیے اسے لے کر نہیں آئی۔ ڈاکٹر آپ نے مجھے کیوں بلایا ہے۔ سب خیریت تو ہے۔“ اسے سی کی کھلی بھی اس کے ہاتھ پہ آنے والے پیسے کے قطروں کو روک نہیں سکی تھی۔ جانے کیوں اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

”ایوری تھنگ از اوکے۔ میں نے احمد کی فائل کیس کو پڑھا ہے۔ میں چاہتا ہوں احمد ٹھیک ہو جائے۔ اور وہ ٹھیک ہو بھی سکتا ہے۔“ ڈاکٹر دانیال نے کہا تو نواء نے الجھ کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”یہ جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ بہت سی لا علاج بیماریوں کا حل ڈھونڈ لیا گیا ہے۔ وہ الگ بات ہے اس کا علاج ہی اتنا مہنگا ہے کہ کوئی عام آدمی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپ کے پاس دو آپشن ہیں۔ یا تو کسی ایسے بچے کو ڈھونڈ لیا جائے جس کا بلڈ ٹشوز ہر چیز احمد سے میچ کرتی ہو تاکہ ہم اس بچے کا بون میرو لے سکیں۔ اور ٹرانسپلانٹ کے ذریعے اس بون میرو کو احمد کی ریڑھ کی ہڈی میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ بھی دو طرح سے ہوتا ہے۔ انجلیٹ کے ذریعے سے صحت مند بچے کا بون میرو لے کر احمد کو بھی انجلیٹ کر دیا جائے۔ یہ پراس ٹھوڑا پین فل ہے۔ اور سیکنڈ آپشن آپریشن ہے۔“ ڈاکٹر دانیال لمحے بھر کے لیے زکے تھے۔ ”چونکہ یہ ایک جھنجک ڈیزیز ہے۔ اس لیے اس کے لیے سیٹ ڈونر احمد کا کوئی بہن بھائی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ بون میرو پیئنڈرڈ پرسنٹ میچ ہو سکتا ہے۔ سو آپ اگر اس بارے میں سوچ سکتے ہیں تو ضرور سوچیں۔ اس لیے کہ اگر سات سال کے بچے کو ڈونر مل جائے اور اس کا بون میرو ٹرانسپلانٹ کر دیا جائے۔ تو ایٹنی پرسنٹ سے بھی زیادہ چانس بن جاتے ہیں۔ بچہ خود سردانیو کرنے لگتا ہے۔ نارمل زندگی کی سمت لوٹ آتا ہے۔ ہر ماہ بلڈ گلوٹانے کی اذیت سے نجات مل سکتی ہے۔ اگر آپ اس بارے میں انٹرسٹ ہیں۔ تو اس کا پورا راسس ہوگا۔ جس میں یہ انشور کیا جائے گا آپ کا ٹیکسٹ بے بی ٹیلی سیما سے فری ہے۔ یہ میڈیکل سروس ہے بانی ہوگا وہی جو اللہ بہتر کرے گا۔ ہم دعا کر سکتے ہیں اور ان شاء اللہ اس بار جو بھی ہوگا اچھا ہوگا۔“ امید کی کرن دکھانے کے بعد ڈاکٹر دانیال نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

نہیں چاہتا۔“ کہتے ہوئے اشتر نے اپنے اوپر اوڑھے اے سی کل کو پڑے کیا۔

”لیکن کیوں؟“ نواء حیرت سے اس کی سمت پلٹی تھی۔

”نواء پلیز۔ یہ بات نہیں کرو۔“ اشتر جھنجھلا تھا۔

”لیکن اشتر! اب کی بار ایسا نہیں ہوگا۔“ نواء بے تابی سے کہتی اشتر کے عقب میں آئی۔

”پہلی بار بھی یہی سوچا تھا۔ ایسا نہیں ہوگا۔ ہماری اولاد صحت مند ہوگی۔ لیکن ویسا نہیں ہوا۔ جیسا

ہم دونوں نے سوچا تھا ہماری اولاد صحت مند نہیں ہوگی۔ ہم احمد کا آرٹیشن کروالیں گے وہ ٹھیک ہو جائے۔ کافی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچنا

نواء میں نے پہلے ہی احمد کی بیماری کو بہت مشکل سے ایکسپٹ کیا ہے۔ مزید ایسی اولاد افرورڈ نہیں کر سکتا۔“

اپنے کندھے پر دھرے نواء کے ہاتھ کو دھیرے سے چھپچھپ کرتے وہ چٹان سے لہجے میں بولا تھا۔

اس کا لہجہ اور انداز اتنا دو ٹوک تھا۔ کہ نواء مزید کچھ بول ہی نہیں باقی تھی۔ وہ اپنے دونوں بازوؤں کو

پہلو میں لٹکاے اشتر کو دیکھ رہی تھی۔ اس اشتر کو جسے وہ نہیں جانتی تھی۔ ہاں وہ اس وقت اپنے سامنے

کھڑے اشتر کو بھلا کب جانتی تھی۔ اپنی آنکھوں میں درآئی تھی کو اپنے اندر اتاری وہ بیئرہ اپنی جگہ پہ آکر

لٹ گئی تھی اور گروٹ بدل کر سر تک قبل اوڑھ کر اپنی آنکھوں کو زور سے بند کر لیا تھا۔ اسے اس وقت نیند

کی ضرورت تھی۔ گہری نیند کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

اگلے تین ماہ اشتر نے احمد کے لیے ڈونر ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ لیکن

اس کی ہر کوشش نا کام ٹھہری تھی۔

”بہتر ہے آپ دونوں خود اپنے بے بی کے بارے میں پلان کریں۔“ ڈاکٹر دانیال نے اشتر کو

مشورہ دیا۔ تو اشتر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ کم سے کم اولاد کے حوالے

”اور اگر ہم اپنے بے بی کے بجائے کسی ڈونر کا انتظام کر لیں تو اس سارے معاملے میں کتنا خرچہ آجائے گا۔“ نواء بے تابی سے پوچھا۔ ”چونکہ اب بون میر وٹراسیلائٹ کے لیے اب باہر جانا نہیں پڑتا سو ڈونر کے مل جانے کے بعد تقریباً ساٹھ سے ستر لاکھ کا خرچہ آئے گا۔“ ڈاکٹر دانیال نے بتایا نواء ہاتھوں میں امید لیے گھر واپس لوٹ آئی تھی۔ اور بے تابی سے اشتر کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔

☆☆☆

اشتر جو افس کے کام کے سلسلے میں آؤٹ آف سٹی گیا ہوا۔ اسی رات دیر تک گھر واپس پہنچا۔ اشتر کو

کھانا دینے کے بعد نواء اس کے اوڑھے لیے چائے بنا کر لے آئی تھی۔ جس وقت نواء کمرے میں داخل ہوئی۔

اشتر بیڈ پہ سوئے احمد کو پیار کر رہا تھا۔ نواء نے مسکرا کر اشتر کی طرف دیکھا اور اس کے پاس آ

بیٹھی۔

”مجھے کچھ بتانا ہے تمہیں اشتر۔ مجھے ڈاکٹر دانیال نے بلایا تھا۔“ دھیمے لہجے میں نواء نے ڈاکٹر

دانیال کی بات کو اشتر کے سامنے رکھا تھا۔ جو اس کے بات سننے کے بعد بے حد خاموش تھا۔

”اشتر! احمد ٹھیک ہو سکتا ہے۔“ نواء کا لہجہ کپکپایا تھا۔

”آہ ہاں۔“ اشتر چونکا۔

”اشتر ہم.....“ نواء نے کچھ کہنا چاہا۔

”میں کل ہی ڈاکٹر دانیال سے بات کرتا ہوں۔ ہمیں وہ کسی ڈونر کے بارے میں بتا دیں ہم احمد کا بون میر وٹراسیلائٹ کروالیں گے۔“

”اور ہمیں اگر کوئی ڈونر نہ ملا تو.....“ نواء نے کسی اندیشے کو مد نظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کیوں نہیں ملے گا۔ ان شاء اللہ مل جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔“ اشتر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔

”اشتر! میں سوچ رہی تھی کہ.....“

لیکن میں وہ نہیں سوچ رہا۔ اور بالکل بھی سوچنا

ڈاکٹر دانیال نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے فیصلہ اشتراک چھوڑا تھا۔

”سوچ کر بتاؤں گا۔“ اشتراک نے آہستگی سے کہا اور نواہ کے ساتھ ہاسپٹل سے باہر آ گیا۔

”اشتراک ڈاکٹر اتنا کہہ رہے ہیں تو ان کیوں نہیں جانتے۔“ نواہ اپنے سے آگے چلتے اشتراک کی سمت نکلی۔

”ڈاکٹر ہیں۔ خدا انہیں ہیں نواہ۔“ اشتراک نے شعلہ بار نظروں سے اسے گھورا۔ تو نواہ ٹھٹھک کر وہیں رکی تھی۔

”ایک اور تحصیل میا کا بچہ ہمیں میٹھی طور پر جاہ کر دے گا۔ ہر ماہ کے آخر میں یہی احمد کو سنبھالنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تم یہ بات کیوں نہیں سمجھ رہی ہو۔ میں جاب کروں گا۔ اپنی زندگی میں موجود رشتوں کو نبھائوں گا۔ یا پھر مرتے دم تک ان بیمار بچوں کے ساتھ ہاسپٹل کے چکر کاٹا رہوں گا۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں ہے نواہ۔ بالکل بھی نہیں۔ میرا یہ آخری فیصلہ ہے۔ احمد کے لیے میں کوئی نہ کوئی ڈونر ڈیونر لوں گا لیکن یہ نہیں کروں گا۔ سبھی نہیں۔ ایسا رسک لوں گا۔“ وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرتا اپنے حتیٰ فیصلے سے آگاہ کرتا اپنی گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔

آنسوؤں کو اس نے اندر اتارنا محال سا ہونے لگا تھا۔ نواہ گاڑی میں آ کر بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ اشتراک اپنے لیوں کو پیچھے اپنی تمام تر توجہ ڈرا نیونگ پر مرکوز کیے ہوئے تھا۔ اس بات سے بے خبر فیصلہ کرنے والے نے تو کب سے اپنا فیصلہ لکھ دیا تھا۔ اشتراک کا انکار انکار ہی رہ گیا تھا۔ جب اگلے ہی دن نواہ کی طبیعت خراب ہونے پر اسے قریبی ہاسپٹل لایا تھا۔ اور جہلیں چند ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر سحرش نواہ کی تین ماہ کی پریکٹس کی رپورٹ اس کے ہاتھ میں میں تھما ہی تھی۔ اشتراک رپورٹ ہاتھ میں لیے ساکت سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ ایسے کیسے ہو سکتا تھا؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ نواہ پہ شک ہونے کا سوال ہی پیدا

سے تو بالکل بھی نہیں۔

”اشتراک کو یقین نہیں ہے۔ ہمارا دوسرا بے بی صحت مند ہوگا یا نہیں۔ یہ خوف انہیں ہر طرح کے فیصلے سے دور کیے ہوئے ہے۔“ نواہ نے اپنی گود میں رکھے اپنے ہاتھوں پر نظریں جماتے ہوئے آہستگی سے کہا تو اشتراک نے اسے گھورا۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈاکٹر۔ اچھوٹائی۔“ نیل پاپ اپنے بازوؤں کے اشتراک نے ڈاکٹر دانیال سے کچھ کہا چاہا۔ تو ڈاکٹر دانیال نے اسے ہاتھ اٹھا کر کچھ بھی بولنے سے روک دیا تھا۔

”ایز اے پرن۔ میں آپ کی فیننگ اور ڈرکو سمجھ سکتا ہوں۔ میں خود بھی باپ ہوں۔ سمجھ سکتا ہوں بچے کو معمولی چوٹ لگے جائے۔ تو ماں کے ساتھ ایک باپ کے دل پہ بھی کیا گزرتی ہے۔ لیکن کچھ فیصلوں کا اختیار خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ہمارے نہیں۔ زندگی، موت، صحت اور بیماری سب اسی کے تابع ہے۔ لیکن کچھ فیصلوں میں اللہ نے انسان کو با اختیار بھی بنایا ہے۔ اگر آپ شادی سے پہلے چھوٹا سا ٹیسٹ کروا لیتے تو اسی وقت آپ کو معلوم ہو جاتا کہ آپ دونوں تحصیل میا مائز ہیں۔ ایسے کیس میں احمد جیسے بچوں کے ہونے کے چانسز بڑھ جاتے ہیں۔ پریکٹس کو نیچے کرنے کے بعد بھی آپ کی ڈاکٹر یہ ٹیسٹ کروا سکتی تھیں۔ جس سے پتا چل سکتا تھا اور آپ دونوں اس بچے کو دنیا میں آنے سے روک سکتے تھے۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں ہمارے معاشرے اتنی اہم بات کو معمولی سمجھ کر انور کر دیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ ایک بیمار بچے کو دنیا میں آ کر سر وائیو کرنا ہے۔ آپ اپنا ٹیسٹ بے بی پلان کریں۔ پریکٹس کے بارہ مہینے میں ایک ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ بچہ مائز یا نارمل ہوا تو اس پریکٹس کو چلنے دیں۔ بے بی ہو جانے کے بعد بھی ایک ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ میں اس سارے ٹائم میں آپ کے ساتھ بچ میں رہوں گا۔ یوں ڈونٹ دری۔ پھر بھی اگر آپ مطمئن نہیں ہوتے تو پھر مرضی ہے آپ کی۔“

ہے۔ ایک بات یاد رکھنا تم نے ماں کے نہ چاہنے کے باوجود اس سے شادی کی ہے۔ اور تم نے انجام دیکھ لیا۔ تاہم اس بار.....“

”جینا!“ شفیق احمد جو اسی وقت لاؤنج میں داخل ہوئے غصے سے بولتے جینا بیگم کی سمت بڑھے۔

”خبردار! اگر تم نے احمد کے بارے میں کوئی بھی غلط لفظ اپنی زبان سے نکالا۔ میں لحاظ نہیں کروں گا۔“ شفیق احمد غصے سے لال ہوئے تھے۔ شوہر کو یوں غصے میں دیکھ کر جینا بیگم خاموش ہوئی تھیں۔ اور بڑبڑاتے ہوئے واپس اپنی جگہ پر بیٹھی گئیں۔

”پاپا! پلیز، بریکس۔ ای غصے میں ہیں تو اس لیے،“ اشتر نے باب کو کول ڈاؤن کرنا چاہا تھا۔

”غصے میں تم تو کیا لحاظ ہی بھول بیٹھی۔ احمد پوتا ہے ہمارا جینا بیگم۔ وہ تا فرمانی کا انجام نہیں ہے۔ ہمارا خون ہے اور کوئی تا فرمانی کی اشتر نے بھاگ کر شادی کی؟۔ ہماری مرضی سے شادی کی ہے۔ ان دونوں نے۔“ نواز کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے شفیق احمد نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

”لیکن شفیق صاحب! آپ ان دونوں کو سمجھائیں کہ پیار بچوں کو سنبھالنا آسان نہیں ہوتا۔ کم سے کم اس بات کا خیال تو تمہیں خود ہونا چاہیے۔“ جینا بیگم نے فوراً ہی اپنے لہجہ کو بدلا تھا۔

”ڈاکٹر نے ہمیں امید دلائی ہے امی۔ اس بار ہمارا بچہ صحت مند ہوگا۔ میں نے نواز کا ٹیسٹ کروایا ہے۔ ابھی تک کی رپورٹس تو ٹھیک ہیں۔ آپ پلیز، میرے لیے دعا کریں۔ اللہ مجھے صحت مند اولاد سے نواز دے۔ احمد کے لیے بھی بے حد ضروری ہے۔ میں پچھلے کئی ماہ سے اس کے لیے ڈونر کی تلاش میں ہوں۔ ان ٹیسٹ ڈاکٹر دانیال نے خود مجھے برسٹی اس معاملے میں ہماری مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک ایک چیز کا بیج ہونا بے حد ضروری ہے۔ جو کسی دوسرے بیج کے ساتھ اکثر بیج ہو بھی جاتی ہیں۔ لیکن احمد کی نہیں ہو پار ہیں۔ میرا احمد ٹھیک

نہیں ہوتا۔ وہ بے چاری تو خود اس کی منتیں کرنے میں مصروف تھی۔ تو پھر کیسے؟ اشتر نے استغماہیہ نظروں سے ڈری سبھی نواز کی سمت دیکھا۔ اس کے دیکھنے کی دیر بھی نواز ڈر کے مارے رونے لگی تھی۔

”بیج میں مجھے نہیں پتا کب اور کیسے؟“ وہ آنسوؤں کے انکے ہوئے کولے کے ساتھ ساتھ بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر بول نہیں پار رہی تھی۔

اشتر نے کچھ بھی کہے بنا اٹھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ وہ جانتا تھا اس معاملے میں نواز اپنی ہی بے خبری تھی۔ جتنا وہ کہہ رہی تھی۔ اشتر نے اپنی نظروں کو اٹھا کر آسان کی طرف دیکھا۔ اور پھر دھیرے سے مسکرا کر نواز کو چپ کر دوانے لگا۔

”کاتب تقدیر کے سامنے ہم سب بے بس ہیں یار۔ جو وہ لکھ دے ہونا تو وہی ہوتا ہے۔ وہ پھر سے نہیں اولاد سے نوازنا چاہتا ہے۔ وہ ہمیں پھر سے اپنی نعمتوں سے نواز رہا ہے۔ اب ناشکری کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا۔ میں راضی ہوں نواز۔ میں اس کی رضا یہ راضی ہوں۔“ اشتر نواز کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا اس کے ہر ڈر اور خوف کو دور کرتا جا رہا تھا۔ لیکن اشتر اور نواز کو نہیں پتا تھا کہ یہ خبر جینا بیگم کو کتنا آگ بگولا کرنے والی تھی۔

☆☆☆

”ایک بار پھر آزمائش ایک بار بھی پیار بچہ ہمارے خاندان کا حصہ بنے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اشتر میں تمہیں ایسی غلطی کرنے کی بالکل بھی اجازت نہیں دوں گی۔ نواز تمہاری پسند بھی اور تم نے ضد کر کے اپنی پسند کو حاصل کر لیا۔ لیکن اب مزید نہیں۔ نواز کو بے شک تم اپنے ساتھ رکھو۔ تمہیں بیچ چاہئیں تو میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ ہم تمہاری دوسری شادی کروائیں گے۔“ جینا بیگم کی اس منطق پہ نواز تو کیا خود اشتر بھی حیرت میں گھرا تھا۔

”کیا ہو گیا ہے امی؟“ اشتر ماں کے قریب آیا۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے۔ بلکہ اب عقل آگئی

ہر دن بہت دعائیں کرتے، بہت خوف میں گزارا تھا۔ جیسے جیسے نوائے ڈیلیوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ ویسے ویسے اس کے لبوں پہ دعاؤں کا دو راجہ بڑھتا جا رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہو گا۔“ جس دن اس کا آپریشن تھا۔ وہ کئی بار اشتر سے پوچھ رہی تھی۔

”ہاں سب ٹھیک ہو گا۔ تم ریلیکس رہو۔“ اشتر نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں نوائے کے ہاتھ کو تھا۔

خوف اس کی آنکھوں سے مترشح تھا۔ وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ مسکرانے سے انکاری تھے۔

”میرے ساتھ رہنا نوائے تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔ تمہارے بغیر کچھ نہیں ہوں۔ تم ہو میرے لیے اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔“ یہاں پہ کیا سوچ رہا تھا میں۔“ اس کے گالوں پہ ہنسرے آنسوؤں کے قطرؤں کو اپنی انگلی کی پوروں پہ چٹنے ہوئے اشتر نے نوائے کی ہینس آنکھوں میں جھانک۔

”کیا سوچ رہے تھے؟“ نوائے نے استفسار کیا۔

”سوچ رہا ہوں۔ خدا سے شکوہ کروں گا بھی تو کس منہ سے۔ اس نے مجھے تمہیں دے دیا۔ تمہیں میری قسمت میں لکھ دیا۔ میرے ہاتھ کی لکیروں میں تمہارا نام لکھ دیا۔“ کہتے ہوئے اشتر نے اپنی ہتھیلی کو نوائے کے سامنے پھیلایا۔ تو نوائے نے اسے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی کو اس کی ہتھیلی پہ پھیرا اور مسکرا کر اس کی ہتھیلی پہ اپنا نام لکھ دیا۔ اور پھر اپنے بائیں ہاتھ کو اشتر کی ہتھیلی پہ سجا دیا۔

اس کی گلابی اور شفاف ہتھیلی اشتر کی نظروں کے عین سامنے تھی۔ وہ دونوں مسکرائے۔ اشتر نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی سے اپنا نام اس کی صاف ہتھیلی پہ لکھا۔

”یہ احساس بہت خوب صورت ہے اشتر۔“ اپنے ہاتھوں کو کسی کی صورت میں بند کیا۔

ہو سکتا ہے۔ امی پہلے میں بھی آپ کی طرح سوچ رہا تھا۔ ڈر رہا تھا۔ خوف زدہ تھا۔“ اشتر کہتے ہوئے ماں کے قدموں میں آ بیٹھا تھا۔ ”لیکن پھر میں نے سوچا۔ وہ اتنا بڑا رحمن ہے رحیم ہے۔ میں کیوں اس کی رحمت سے مایوس ہو رہا ہوں۔ مجھے مایوس نہیں ہونا۔ مایوس ہو جانے کا مطلب ہے میں نے خود کو اندھیرے میں گم کر دیا ہے۔ میں امید کا ایک چھوٹا سا چراغ ہی ہاتھ کی ہتھیلی پہ سجا کر سویرا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ گہری رات کو دن کے اجالے میں تبدیل کرنا جانتا ہے۔ وہ وہاں سے اشارہ کرے اور امید کے بیج کو تار و درخت میں بدلتا ہے۔“ دعا کریں امی میری اور نوائے کی امید کا یہ بیج تار و درخت میں بدل جائے دعا کریں امی۔ میرے ہاتھ سے یہ چراغ بجھنا جائے۔“

گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے اشتر نے اپنا سر پاں کی گود میں رکھا تو جینا بیگم بے اختیار رو پڑی تھیں۔ اشتر ان کا سب سے لاڈلا اور پیارا بیٹا تھا۔ اسے پولی پریشان اور مضطرب دیکھ کر جینا بیگم بے چین ہوتی تھیں۔

”میری ہر ذمہ داریوں کے لیے ہے۔“ ماں کا دل کھلا تھا۔ انہوں نے اشتر کے چٹنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو ریحان بھائی بھی اٹھ کر چھوٹے بھائی کے قریب آئے تھے۔

”فکرمات کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ ہر طرح کے حالات میں ہر مشکل میں۔“ ریحان نے بھائی کے کندھے پہ ہاتھ مارا۔

”ہاں فکرمات کرو۔ ہم سب اللہ سے بہت دعا کریں گے۔ اس بار ہمارے گھر میں آنے والا نیا مہمان بہت خوشیاں لے کر آئے۔“ نمرئی نے نوائے کو اپنے ساتھ لگایا تو نوائے بھیگی آنکھوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی تھی۔ وہاں لاؤنج میں سب ہی افراد دم آنکھوں کے ساتھ ایک ساتھ مسکرا دیے تھے۔

ادا کرنے کے لیے لفظ نہیں مل رہے۔ جس نے انہیں ایک بار پھر اتنی بڑی خوشی سے نوازا تھا۔ علی ان کا نارل بچہ تھا۔ اور اس بچے کے ساتھ ساتھ اللہ نے انہیں احمد کی نئی زندگی کی بھی امید دلائی تھی۔ وہ دونوں ہر وقت خدا کا شکر ادا کرتے نہیں سمجھتے تھے۔

☆☆☆

پورے تین سال کے بعد جب احمد باج سال کا تھا۔ اور علی تین سال کا۔ ڈاکٹر دانیال نے احمد کے بون میر وٹرنسپلانٹ کی ڈیٹ دی تھی۔

”کلی ہیں آپ۔ میچنگ ٹیسٹ میں علی اور احمد کا بون میر وٹچ ہیں۔ ان فیکٹ پیٹنڈر پڑسٹ پیچ ہے۔“ ڈاکٹر دانیال نے اپنے سامنے بڑی بچوں کی ٹیسٹ رپورٹ کا رزلٹ نواہ اور اشتر کو بتایا تھا۔

”یقینی اب آپریشن ہو سکتا ہے۔“ ڈاکٹر دانیال نے جیسے نواہ اور اشتر کو جہان بھری خوشی کی خبر دی تھی۔

اور یوں ٹھیک دو ماہ بعد احمد کا بون میر وٹرنسپلانٹ کر دیا گیا تھا۔ صدقہ خیرات اور شکرانے کے لفظ نواہ اور اشتر کے لبوں سے خدا نہیں ہوتے تھے۔ وہ رب انہیں آزما کر نوازنے پہ جب آیا تو نوازنا ہی چلا گیا تھا۔

ٹرنسپلانٹ کامیاب ہو گیا تھا۔ احمد کے بار بار ٹیسٹ کیے گئے تھے۔ جس میں دیکھا گیا تھا۔ ڈونر سیل کی پریسیج کیا ہے۔ اس کے خون میں موجود سرخ خلیے یا پھر سفید خلیے ٹوٹ تو نہیں رہے۔ چھ ماہ کے انڈر ریڈرویشن کے بعد ڈاکٹر نے احمد کو صحت مند بچہ قرار دے دیا تھا۔ جو زندگی میں خود سر وائیو کر سکتا تھا۔ جسے اب ہر ماہ خون لگوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو نواہ اور اشتر کے لیے آزمائش بن کر تو آیا تھا۔ لیکن پھر ہمیشہ کے لیے خوشی بن گیا۔

”بڑے ہو کر کیا بنو گے۔“ نواہ نے جھک کر احمد سے سوال کیا۔

”میں بڑا ہو کر ڈاکٹر اکل کی طرح ڈاکٹر بنوں گا۔“ احمد نے اونچی آواز میں کہا تو نواہ اور اشتر

”تم بہت خوب صورت ہو نواہ میری زندگی کے آسمان پہ چمکا ہوا وہ چاند جس کی روشنی کے بنا میں کچھ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ تم پریشان نہیں ہونا۔ میں اور تم، ہمارے بچے ہماری دنیا ہیں کافی ہیں۔ میں نے ہر فیصلہ ہر دعا کو خدا پہ چھوڑ دیا۔ وہ جس بھی حال میں رکھے ہم خوش خوش رہیں گے۔“ اشتر نے کہا تو نواہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شکر بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم میرا فخر ہو اشتر۔ میرا سب کچھ۔“ نواہ نے دھیرے سے کہا۔ اور نرس کے قریب آنے سے پہلے اس نے اپنے ہاتھ کو اشتر کے ہاتھ سے الگ کر لیا تھا۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ نرس نے مسکراتے ہوئے نواہ سے پوچھا۔ تو نواہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آپ کے آپریشن کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔“ نرس نے کہتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے اشتر کی طرف دیکھا۔ اشتر نے دھیرے سے سے اثبات میں سر ہلایا اور نواہ کے پاس سے ہٹ گیا۔

”فکرمٹ کرو والد سب ٹھیک کرے گا۔“ سارا بھابھی نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ تو اشتر ان کی طرف دھیرے سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے ڈاکٹر حشر سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ جہاں اسے پرمیشن پیپر پہ سائن کرنے تھے۔

☆☆☆

نواہ آپریشن تھیرٹن تھی۔ آپریشن تھیرٹن کے باہر موجود ہر شخص اس کی اور بچے کی صحت کے لیے دعا گو تھا۔ ان سب کی دعائیں میٹر ٹھہری تھیں۔ نواہ نے ایک صحت مند بچے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی پیدائش کے بعد ٹیسٹ کر دیا گیا۔ اس میں بھی علی کے ٹیسٹ ٹھہر آئے تھے۔ وہ ٹیلیسیما یا نرس نہیں تھا۔

خوشی سے زیادہ نواہ اور اشتر کو اپنے رب کا شکر

دووں ایک ساتھ مسکرا دیے۔
 ”ہمارا بیٹا مسیحا بنے گا۔“ علی اور احمد کو کھیلتے
 دیکھتے ہوئے اشتر نے نواہ کے قریب جھٹکتے ہوئے
 کہا۔

”ہمارے دووں بیٹے ڈاکٹر بنیں گے
 اشتر دیکھا نہیں ہاسپٹل میں مریض زیادہ ہوتے
 تھے اور ڈاکٹر کتنے کم۔ مہمنوں کا طویل انتظار مریض
 کے ساتھ کتنا طویل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ ہم کوشش
 کریں گے۔ ہم اپنے بچوں کو خود کسی کے کام آنے
 کے قابل بنا سکیں۔ بچوں کو ٹھیک ہے لیکن ہم
 کیسے؟“ اشتر نے ابھرا دیا۔

”بلڈ ڈونیشن کر گے۔ ہم خود اور اپنے ارد گرد
 رہنے والوں کو خون دینے پر آمادہ کریں گے۔ ایک صحت
 مند انسان کا خون مسیحا کے مریضوں کے لیے نئی
 زندگی کی علامت ہے۔ ہم نئی امید بن سکتے ہیں
 اشتر۔ ہم لوگوں میں بلڈ ڈونیشن کی آگاہی دے سکتے
 ہیں۔ اشتر خون کا ایک قطرہ زندگی ہے اور ہم یہ زندگی
 اب ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں
 نا۔“ نواہ نے اشتر سے اپنی بات کی تائید چاہی۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تمہارے کہے بنا ہی
 میں نے سندس فاؤنڈیشن میں ایسے بچوں کے علاج
 ان کی آگاہی سے متعلق ڈاکٹر فیصل سے بات کر لی
 ہے۔ کرن میرج سے پہلے ہی نہیں بلکہ ہر میرج سے
 پہلے ہم لوگوں کو یہ آگاہی دیں گے۔ کہ وہ لڑکے اور
 لڑکی کا چھوٹا سائینٹ جس میں یہ پتا چل سکتا
 ہے۔ مسیحا مائز ہیں یا نہیں۔ تاکہ آنے والے
 بچوں کو اس بیماری اور تکلیف سے بچایا جاسکے۔ اور
 ہم اپنے معاشرے کو اس موڈی بیماری سے محفوظ رکھ
 سکیں۔“ اشتر کے لہجے میں عزم تھا۔ اور نواہ کی
 آنکھوں میں نئی امید کی چمک۔

☆☆☆

دل کا دریا بہ ہی گیا
 عشق عبادت بن ہی گیا
 خود کو مجھے تو سو نہ دے

میری ضرورت تو بن ہی گیا
 بات دل کی نظروں نے کی
 سچ کہ رہا تیری قسم
 تیرے بن اب نہ لیں گے ایک بھی دم
 تجھے کتنا چاہنے لگے ہم
 تیرے ساتھ ہو جائیں گے ہم
 تجھے کتنا چاہنے لگے ہم

یعنی ایک بار پھر یہ ثابت ہونے والا تھا۔ اشتر
 اور نواہ کا ملنا صرف ان دووں کے لیے ہی نہیں۔ بلکہ
 کئی خاندانوں کی زندگی میں روشنی بھرنے والا تھا۔
 اور یوں چند دن کے بعد ہی وہ دووں سندس
 فاؤنڈیشن سے منسلک ہو کر وہ کرنے لگے جو ان سے
 پہلے ان کے خاندان میں کسی نے نہیں کیا تھا۔
 امید، خوشی اور روشنی کا حق نواہ اور اشتر کا ہی نہیں
 تھا۔ بلکہ وہ اس حق کو دوسروں کی زندگی میں بھی شامل
 کرنے کے لیے عملی میدان میں آ چکے تھے۔

وہ درد جس سے کبھی اشتر اور نواہ کا خاندان واقف
 نہیں تھا۔ اس درد سے ملنے کے بعد انہیں احساس ہوا
 تھا۔ بچے تکلیف میں ہوں بیماری میں ہوں۔ تو کیسے
 ایک گھر پریشانی میں گھر جاتا ہے۔ اور اب وہ دووں ہی
 نہیں بلکہ ان کے گرد رہنے والے کئی لوگ بھی اس
 کا رنج میں بڑھ کر حصہ لینے لگے تھے۔ تو پھر بات
 چاہے بلڈ ڈونیشن کی ہو یا پھر قریب بچوں کے علاج کے
 لیے رقم ضرورت۔ وہ سب جلد ممکن ہونے لگا۔ وہ
 سندس فاؤنڈیشن کے توسط سے لوگوں کے کام آنے
 لگے تھے۔ یہی زندگی کا اصل ہے۔ یہی وہ زندگی کا اصل
 چہرہ تھا جس سے احمد نے انہیں ملوایا تھا۔

وہ سب خوش تھے، مطمئن تھے اور اب تو پر عزم
 بھی..... زندگی کا چراغ روشن تھا۔ اور خوب روشن
 ہونے والا تھا..... اور روشن رہنے والا تھا۔ زندگی یہی
 تھی۔ احمد والا کے لوگ زندگی کے اس راز کو پا چکے
 تھے۔ اور اب باری آپ کی کہ آپ کس طرح مخلوق
 کی مدد کے لیے میدان میں آتے ہیں۔

☆☆